مشرق

کہانی میگزین

4 تا 10 اکتوبر 2026

مذاکرات کی میز سج گئی

- سیاسی کشیدگی، داخلی استحکام اور قومی سیاسی قیادت کا اصل امتحان
- جسٹس طاہرہ صفدر سے آج کی نوجوان وکلاء تک... جدوجہد کا سفر جاری
  بلوچستان کی بیٹیاں، عدالتوں میں قانون کی آواز
- پاکستان کی سیاسی فضا ایک بار پھر شدید کشیدگی کا شکار
  پی ٹی آئی کا اسلام آباد لانگ مارچ اور خیبر پختونخوا میں ایمرجنسی یا گورنر راج کی بازگشت:

مذاکرات کی میز سج گئی

سیاسی کشیدگی، داخلی استحکام اور قومی سیاسی قیادت کا اصل امتحان

حکومت اور اپوزیشن آمنے سامنے، پارلیمان میں سیاسی رابطے کا نیا باب شروع

”داخلی استحکام قومی ضرورت ہے“ کور کمانڈرز کانفرنس میں عسکری قیادت کا دوٹوک مؤقف

بلوچستان ڈائری
جعفر خان ترین

قومی سیاسی منظرنامے پر ہر چند کہ گزشتہ چند دنوں بلکہ ہفتوں سے ایک عجیب سا ماحول بنا ہوا ہے اور اپوزیشن و حکومت کے مابین تند و تیز بیانات کا سلسلہ تادم تحریر جاری ہے تاہم اسی بڑھتے ہوئے سیاسی درجہ حرات اور غیر یقینی کو ہوا دیتے سیاسی منظرنامے پر جمعہ کے روز ایک اہم پیشرفت یہ ہوئی کہ حکومت اور اپوزیشن کے مابین مذاکرات نے عملی صورت اختیار کی نہ صرف مذاکرات کا ایک یعنی پہلا دور کامیابی سے مکمل بھی ہوگیا ہے بلکہ اگلے دور سے مزید نتیجہ خیزی اور حوصلہ افزا پیشرفت کی قوی امیدیں وابستہ ہیں۔ یہ پیش رفت اس لیے بھی اہم ہے کہ ملکی سیاست میں اس وقت محض معمول کا سیاسی اختلاف نہیں بلکہ کئی معاملات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ حکومت کو سیاسی دباؤ کا سامنا ہے، اپوزیشن اپنے مطالبات کے لیے متحرک ہے، اسلام آباد کی جانب لانگ مارچ کی بات ہو رہی ہے اور دوسری طرف ملک بالخصوص خیبر پختونخوا میں سکیورٹی کی صورتحال بھی ایک اہم پس منظر کے طور پر موجود ہے۔ ایسے ماحول میں سیاسی قیادت کا ایک میز پر بیٹھنا اس بات کی علامت ہے کہ اختلافات کے باوجود رابطے کا امکان ختم نہیں ہوا۔

بڑھتی ہوئی سیاسی کشیدگی یقیناً افسوسناک ہے اور ان حالات میں قومی سیاسی قیادت کا اصل امتحان یہی ہے کہ غیر یقینی کی صورتحال اور کشیدگی کا خاتمہ کر کے سیاسی استحکام کے لئے نتیجہ خیز کردار ادا کریں کوئی شک نہیں کہ احتجاج ہر جماعت کا حق ہے مگر احتجاج کی آڑ میں تشدد، انتشار پھیلانے کی اجازت کسی کو بھی نہیں ہونی چاہئے گزشتہ روز جو کور کمانڈرز کانفرنس ہوئی ہے اس میں عسکری قیادت نے دوٹوک موقف اختیار کیا ہے اور قومی مفاد سے ہم آہنگ عزم کا اعادہ

پاکستان کے لیے داخلی استحکام انتہائی اہم ہے، پرتشدد احتجاج کی اجازت کسی کو بھی نہیں دی جاسکتی

اختلاف جمہوریت کا حسن ہے مگر بحرانی کیفیت اور غیر یقینی کی صورتحال ملک و قوم کے مفاد میں نہیں

کیا ہے۔ کور کمانڈر کانفرنس میں کہا گیا ہے کہ پاکستان کے لیے داخلی استحکام انتہائی اہم ہے، کسی بھی جواز پر، پُرتشدد انتشار یا 9 مئی جیسے حالات پیدا کرنے کی کوشش کو فیصلہ کُن طاقت اور قانون کے ساتھ بلا امتیاز اور بلا جھجک نمٹا جائے گا۔ آئی ایس پی آر کے مطابق فیلڈ مارشل سید عاصم منیر کی زیر صدارت 277 ویں کور کمانڈرز کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں فورم کی مسلح افواج، قانون نافذ کرنے والے اداروں اور مادر وطن کے دفاع میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والے معصوم شہریوں کے لیے فاتحہ خوانی کی گئی، کانفرنس کے شرکا نے شہدا کی بے مثال قربانیوں کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا۔ شرکاء کور کمانڈرز کانفرنس نے کہا کہ افغانستان سے ہونے والی دہشت گردی کے خلاف ٹارگٹڈ کارروائیاں پاکستان کا دفاعی حق ہیں، ہندوستان کے آلہ کار کے طور پر دہشت گردی کے سنگین نتائج کی ذمہ دار صرف اور صرف طالبان کی مخبوط الحواس قیادت ہے۔ فورم نے قانون نافذ کرنے والے اداروں کی جانب سے تسلسل کے ساتھ کامیاب انٹیلی جنس کی بنیاد پر جاری انسدادِ دہشت گردی کی کارروائیوں کو سراہا اور کہا کہ دہشت گردی کے خاتمے کے لیے زمینی کارروائیوں کے ساتھ بہترین انتظامی اور گورننس کے اقدامات ناگزیر ہیں، دہشت گردی کے خاتمے کے لیے لازم ہے کہ گورننس کو بنیادی سطح پر عوام کے قریب ترین لایا جائے۔ فورم نے کہا کہ یہ بھی ضروری ہے کہ عوام کے ساتھ دہشت گردی کی وجوہات اور معاملات پر موثر رابطہ کاری اور بیانیے پر کام کیا جائے، دہشت گردی کے خاتمے کے لیے مخصوص عناصر کے زیر سایہ چلنے والے کرائم ٹیرر گٹھ جوڑ کو توڑنا ضروری ہے جس کے لیے پولیس کی استعدادِ کار کو بھی بڑھانا ہوگا۔ فورم نے اتفاق کیا کہ پاکستان کے لیے داخلی استحکام انتہائی اہم ہے، کسی بھی جواز پر، پُرتشدد انتشار یا 9 مئی جیسے حالات پیدا کرنے کی کسی بھی کوشش کو فیصلہ کُن طاقت اور قانون کیساتھ بلا امتیاز اور بلا جھجک نمٹا جائے گا۔

ہمیں امید ہے کہ قومی سیاسی قیادت موجودہ حالات میں اپنی ذمہ داریوں کا نہ صرف احساس کرے گی بلکہ ان کی بجا آوری بھی یقینی بنائی جائے گی مذاکرات کا آغاز اچھی پیشرفت ہے حکومت اور اپوزیشن دونوں کے لیے ضروری ہے کہ موجودہ مذاکرات کو فوری سیاسی فتح یا شکست کے پیمانے سے نہ دیکھا جائے۔ کسی ایک نشست میں تمام مسائل کا حل نکلنا ممکن نہیں۔ کئی معاملات پر مزید مشاورت درکار ہوگی، بعض نکات پر قانونی اور آئینی پہلو زیر بحث آئیں گے اور کچھ معاملات پر شاید فریقین کو اپنے اپنے مؤقف میں گنجائش پیدا کرنا پڑے۔ لیکن جب گفتگو شروع ہوجائے تو حل کے امکانات پیدا ہوتے ہیں، جبکہ رابطہ ختم ہوجائے تو فاصلے مزید بڑھتے ہیں۔ اسلام آباد میں احتجاج ہو یا کسی دوسرے شہر میں سیاسی اجتماع، جمہوری سرگرمیوں کا بنیادی تقاضا یہی ہے کہ وہ آئین اور قانون کے دائرے میں رہیں۔ ملکی سیاست کے موجودہ ماحول کا ایک دوسرا اہم پہلو خیبر پختونخوا کی سکیورٹی صورتحال ہے۔ صوبے میں دہشت گردی کے واقعات اور پاک افغان سرحد سے متعلق کشیدگی نے پہلے بہت سے چیلنجز مسائل و مشکلات کو جنم دیا ہے صدر مملکت آصف علی زرداری اور وزیراعظم شہباز شریف کے درمیان ہونے والی ملاقات میں بھی ملک کی سیاسی اور سکیورٹی صورتحال کا جائزہ لیا گیا اور خیبر پختونخوا کے حالات پر تشویش کا اظہار کیا گیا۔ دہشت گردی کے خلاف قومی عزم مضبوط کرنے اور امن و استحکام کے لیے متعلقہ اداروں کے درمیان مؤثر تعاون کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا۔ یہ پس منظر سیاسی قیادت سے مزید احتیاط کا تقاضا کرتا ہے۔ ملک میں جب سکیورٹی کے مسائل موجود ہوں تو سیاسی اختلافات اپنی جگہ رہتے ہوئے بھی قومی سلامتی کے معاملات پر کم از کم مشترکہ سوچ پیدا کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔ حکومت اور اپوزیشن ایک دوسرے کی پالیسیوں سے اختلاف کر سکتے ہیں، لیکن دہشت گردی اور شہریوں کے تحفظ جیسے معاملات قومی نوعیت کے ہیں ان پر کوئی دو رائے نہیں ہونی چاہئے اور اس حوالے سے رتی برابر انکار یا اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ موجودہ مذاکرات میں سیاسی مطالبات کے ساتھ وسیع تر قومی صورتحال کو بھی سامنے رکھنا ہوگا۔ اگر سیاسی کشیدگی میں اضافہ ہوتا ہے تو اس کے اثرات صرف ایوانوں تک محدود نہیں رہتے۔ انتظامیہ، کاروبار، عام شہری، تعلیمی سرگرمیاں اور روزمرہ زندگی بھی اس سے متاثر ہوسکتی ہے۔ سیاسی قیادت کو اسی وسیع تصویر کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے فیصلے کرنا ہوں گے۔

حکومت اور اپوزیشن کے درمیان مذاکرات کے انعقاد میں اسپیکر قومی اسمبلی سردار ایاز صادق کا کردار بھی اہم ہے۔ انہوں نے واضح کیا ہے کہ وہ سہولت کار کے طور پر اپنا کردار ادا کر رہے ہیں اور ان کا دفتر مسائل کے حل کے لیے مذاکرات کے لیے کھلا ہے۔ ان کا یہ مؤقف کہ اختلاف رائے اور مسائل کے حل کے لیے مذاکرات ضروری ہیں، موجودہ صورتحال میں پارلیمان کے کردار کی طرف بھی توجہ دلاتا ہے۔ پارلیمنٹ صرف قانون سازی کی جگہ نہیں بلکہ سیاسی اختلاف کے اظہار اور اسے ادارہ جاتی انداز میں حل کرنے کا بنیادی فورم بھی ہے۔ حکومت ایوان میں موجود ہے، اپوزیشن بھی ایوان کا حصہ ہے اور دونوں جماعتوں کے منتخب نمائندے ایک ہی آئینی نظام کے تحت کام کر رہے ہیں۔ اس لیے اگر کسی سیاسی تنازع کا راستہ پارلیمنٹ سے نکل سکتا ہے تو اسے سڑکوں کی کشیدگی تک پہنچنے سے پہلے اسی فورم پر آزمانا زیادہ مفید ہوسکتا ہے۔

موجودہ مذاکرات کا اگلا دور اسی لیے اہم ہوگا کہ ابتدائی ملاقات میں فریقین نے ایک دوسرے کے مطالبات سن لیے ہیں۔ اب گفتگو کو محض مؤقف دہرانے سے آگے لے جانے کی ضرورت ہوگی۔ جہاں کوئی درمیانی راستہ نکل سکتا ہے وہاں اس پر بات ہونی چاہیے، جہاں قانونی پیچیدگی ہے وہاں اسے واضح کیا جانا چاہیے اور جہاں کسی معاملے پر اتفاق ممکن نہیں وہاں کم از کم اختلاف کو پرامن سیاسی طریقے سے برقرار رکھنے کی گنجائش پیدا کی جانی چاہیے۔

موجودہ مذاکراتی عمل کو کسی فوری معجزے کی توقع کے ساتھ دیکھنے کے بجائے ایک سیاسی عمل کے طور پر آگے بڑھانا ہوگا۔ پہلا دور مکمل ہو چکا ہے، دوسرا دور شروع ہونے جا رہا ہے اور فریقین اپنے اپنے مطالبات سے آگاہ ہیں۔ اب اگلا مرحلہ اس بات کا ہوگا کہ ان مطالبات میں سے کن نکات پر بات آگے بڑھ سکتی ہے اور کہاں اختلاف برقرار رہ سکتا ہے۔ سیاسی تاریخ میں مذاکرات ہمیشہ آسان نہیں ہوتے۔ کئی بار فریقین سخت مؤقف کے ساتھ میز پر آتے ہیں اور کئی نشستوں کے بعد کسی نتیجے تک پہنچتے ہیں۔ بعض اوقات مذاکرات ناکام بھی ہوتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ گفتگو کا راستہ ہی غلط تھا۔ اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ سیاسی قوتیں رابطہ برقرار رکھیں اور اختلاف کو مکمل تعطل میں تبدیل نہ ہونے دیں۔ پاکستان کے موجودہ حالات میں یہی راستہ زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ حکومت کو اپنی آئینی ذمہ داریاں پوری کرتے ہوئے سیاسی رابطہ برقرار رکھنا ہوگا، جبکہ اپوزیشن کو اپنے مطالبات کے ساتھ مذاکراتی عمل کو بھی اہمیت دینا ہوگی۔ دونوں فریق اگر ایک دوسرے کو سیاسی حقیقت کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے بات آگے بڑھائیں تو کئی پیچیدہ معاملات پر کم از کم قابلِ عمل فہم پیدا ہوسکتی ہے۔ ملک کو اس وقت سیاسی اختلاف کے خاتمے سے زیادہ اختلاف کو سنبھالنے کی ضرورت ہے۔ اختلاف جمہوریت کا حصہ ہے، لیکن مسلسل تصادم جمہوری اداروں کے لیے بھی مشکل پیدا کرتا ہے۔

حکومت اور اپوزیشن کے درمیان موجودہ مذاکرات اس لحاظ سے ایک اہم موقع ہیں کہ سیاسی درجہ حرارت کو کم کرنے، غلط فہمیوں کو دور کرنے اور ایسے نکات تلاش کرنیکی کوشش کی جاسکتی ہے جن پر مشترکہ بنیاد قائم ہوسکے۔

اب جبکہ حکومت اور اپوزیشن کے درمیان بات چیت کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ اسے وقتی سیاسی حکمت عملی کے بجائے سنجیدہ قومی مشاورت کا موقع سمجھا جائے۔ سیاسی اختلافات اپنی جگہ رہیں، جماعتی مفادات بھی اپنی جگہ موجود رہیں، مگر قومی مفاد سب کے لیے ایک مشترکہ حوالہ بن سکتا ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر موجودہ سیاسی کشیدگی کو مفاہمت کے کسی قابلِ عمل راستے کی طرف لے جایا جاسکتا ہے۔ فریقین کے سامنے اصل امتحان یہی ہوگا کہ وہ اپنے اپنے مؤقف کو کس قدر مضبوطی سے پیش کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرے فریق کی بات سننے کے لیے کتنی سیاسی گنجائش پیدا کرتے ہیں۔ اگر گفتگو جاری رہی، رابطے قائم رہے اور قومی ذمہ داری کو سیاسی مفاد کے ساتھ ساتھ اہمیت دی گئی تو موجودہ بحران کے اندر سے بھی ایک بہتر سیاسی راستہ نکلنے کی گنجائش موجود ہے۔ پاکستان کی سیاست کو فی الحال اسی راستے کی ضرورت ہے۔

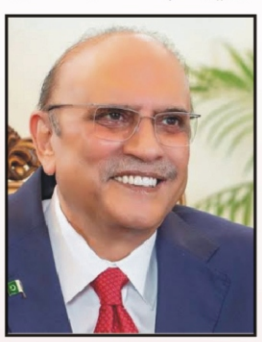

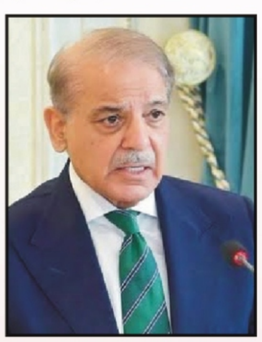

بلوچستان کی بیٹیاں، عدالتوں میں قانون کی آواز

عزم، جدوجہد اور انصاف کے سفر میں ایک روشن مثال

جسٹس طاہرہ صفدر سے آج کی نوجوان وکلاء تک... جدوجہد کا سفر جاری

بلوچستان کی بیٹیاں، عدالتوں میں قانون کی آواز

تحریر:
قدیر احمد نصاری

کوئٹہ کی مختلف عدالتوں میں اس وقت ڈیڑھ سو خواتین وکلاء کام کر رہی ہیں

جب ایک خاتون کالا کوٹ پہنتی ہے تو ہر خاتون کو ایک نئی ہمت اور امید مل جاتی ہے

بلوچستان کو عموماً قبائلی روایات، وسیع جغرافیہ، مشکل معاشی حالات اور محدود مواقع کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے، لیکن اس سرزمین کی ایک دوسری تصویر بھی تیزی سے سامنے آ رہی ہے۔ یہ تصویر تعلیم یافتہ، بااعتماد اور اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے والی بلوچ، پشتون، ہزارہ اور دیگر برادریوں سے تعلق رکھنے والی خواتین کی ہے۔ اسی بدلتی ہوئی تصویر کا ایک خوبصورت باب بلوچستان کے قانونی شعبے میں خواتین کی بڑھتی ہوئی تعداد ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک بلوچستان کی عدالتوں میں کسی خاتون وکیل کا سیاہ کوٹ پہن کر پیش ہونا ایک غیر معمولی منظر سمجھا جاتا تھا۔ آج صورتحال تبدیل ہو رہی ہے۔ ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق کوئٹہ کی عدالتوں میں تقریباً 150 خواتین وکالت کر رہی ہیں اور ہر سال 20 سے 25 نئی خواتین بطور وکیل اس پیشے کا حصہ بن رہی ہیں۔ یہ اعداد صرف تعداد میں اضافے کی خبر نہیں بلکہ بلوچستان کے معاشرتی سفر میں ایک اہم تبدیلی کی علامت بھی ہیں۔ یہ تبدیلی اس لیے بھی اہم ہے کہ قانون کا شعبہ محض روزگار کا ذریعہ نہیں۔ وکیل عدالت میں کسی شہری کے بنیادی حقوق، عزت، ملکیت، خاندان، آزادی اور انصاف کے لیے آواز اٹھاتا ہے۔ جب اس شعبے میں خواتین کی تعداد بڑھتی ہے تو معاشرے کے ایک بڑے حصے کو اپنی بات ایسے شخص کے سامنے رکھنے کا موقع ملتا ہے جو ان کے مسائل کو زیادہ قریب سے سمجھ سکتا ہے۔

پاکستان میں خواتین کا قانون کے شعبے میں سفر نیا نہیں۔ ملک کی پہلی خاتون وکیلوں میں سلمیٰ صبوحان کا نام نمایاں ہے، جبکہ بعد کے برسوں میں جسٹس مجیدہ رضوی، جسٹس فخرالنسا کھوکھر، جسٹس ناصرہ اقبال اور دیگر خواتین نے عدلیہ اور قانونی میدان میں اپنی شناخت قائم کی۔ 1994 میں خواتین کی پہلی کھیپ میں ہائی کورٹس میں جج بننے والی شخصیات نے یہ ثابت کیا کہ قانون اور عدلیہ صرف مردوں کا میدان نہیں۔

پاکستان کی قانونی تاریخ میں عاصمہ جہانگیر کا کردار بھی نمایاں رہا۔ وہ نہ صرف انسانی حقوق کے مقدمات کے حوالے سے جانی گئیں بلکہ سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن آف پاکستان کی صدر بننے والی پہلی خاتون بھی رہیں۔ اسی طرح جسٹس عائشہ ملک نے 2022 میں سپریم کورٹ آف پاکستان کی پہلی خاتون جج بن کر ایک تاریخی سنگ میل عبور کیا لیکن بلوچستان کی خواتین کے لیے سب سے روشن مثال شاید جسٹس سیدہ طاہرہ صفدر رہیں۔

طاہرہ صفدر، جنہوں نے تاریخ بدل دی:

جسٹس سیدہ طاہرہ صفدر نے بلوچستان میں خواتین کے لیے قانون اور عدلیہ کے دروازے اس وقت کھولے جب یہ شعبہ تقریباً مکمل طور پر مردوں کے زیر اثر تھا۔ وہ 1982 میں بلوچستان میں سول جج مقرر ہونے والی پہلی خاتون بنیں۔ بعدازاں مختلف عدالتی مناصب سے گزرتے ہوئے یکم ستمبر 2018 کو چیف جسٹس بلوچستان ہائی کورٹ کے منصب پر فائز ہوئیں۔ یوں وہ پاکستان کی کسی ہائی کورٹ کی پہلی خاتون چیف جسٹس بن گئیں۔ ان کا سفر دراصل آج بلوچستان کی عدالتوں میں نظر آنے والی ان سینکڑوں خواتین کے لیے ایک تاریخی پس منظر فراہم کرتا ہے جو قانون کو اپنا پیشہ بنا رہی ہیں۔ ایک خاتون کا جج بننا ایک کامیابی تھی، لیکن آج تقریباً ڈیڑھ سو خواتین کا عدالتوں میں بطور وکیل موجود ہونا ایک مختلف نوعیت کی سماجی تبدیلی ہے۔ بلوچستان سے خواتین وکلاء میں ایک نمایاں نام ایڈووکیٹ صابرہ اسلام کا ہے جو بلوچستان کی ایک ممتاز قانونی شخصیت ہیں جنہوں نے رکاوٹیں عبور کرتے ہوئے بلوچستان کی پہلی خاتون ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ انہوں نے خطے میں خواتین کی موثر نمائندگی اور قانونی حقوق کے فروغ کے لیے اہم کردار ادا کیا۔

بلوچستان میں خواتین وکلا کی نئی نسل مختلف شعبوں میں کام کر رہی ہے۔ کوئی فوجداری مقدمات لڑ رہی ہے، کوئی خاندانی تنازعات میں خواتین کی نمائندگی کر رہی ہے، کوئی انسانی حقوق کے مقدمات اٹھا رہی ہے اور کوئی قانونی اصلاحات کے لیے آواز بلند کر رہی ہے۔ حالیہ برسوں میں ایڈووکیٹ فاطمہ نذر کا نام بھی نمایاں ہوا ہے اسی طرح ایڈووکیٹ فرزانہ خلجی بلوچستان میں خواتین کے لیے قانونی معاونت اور انصاف تک رسائی کے حوالے سے کام کرنے والی نمایاں شخصیات میں شامل ہیں۔

کوئٹہ کی وکیل عفیفہ تحریم کا نام بھی پاکستان ویمن لائرز کونسل کی فہرست میں بلوچستان سے وابستہ قانونی ماہر کے طور پر موجود ہے۔ گوادر کی شازیہ محراب نے بھی تاریخ رقم کی۔ انہیں گوادر کی پہلی خاتون وکیل کے طور پر رپورٹ کیا گیا اور ان کا سفر اس بات کی مثال ہے کہ بلوچستان کے نسبتاً دور دراز علاقوں سے بھی خواتین اب قانون کے پیشے میں داخل ہو رہی ہیں۔ اسی طرح جلیلہ حیدر کا نام بھی بلوچستان کی خواتین وکلاء کی جدوجہد کے حوالے سے نمایاں ہے۔ وہ ہزارہ برادری سے تعلق رکھنے والی انسانی حقوق کی وکیل ہیں اور خواتین و کمزور طبقات کے قانونی مسائل کے لیے کام کرتی رہی ہیں۔

ایڈووکیٹ طلعت رحمان بھی ایک نوجوان خاتون وکیل کی حیثیت سے انصاف کے پیشہ میں اپنا کردار ادا کر رہی ہیں۔

ایڈووکیٹ طلعت رحمان وکالت کے ساتھ ساتھ سوشل ورک اور فنون لطیفہ میں بھی اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر رہی ہیں اور ایک مستند اور تجربہ کار ٹی وی کمپیئر کی حیثیت سے بھی جانی پہچانی جاتی ہیں۔ ایڈووکیٹ انعم خیر، ایڈووکیٹ ثناء جلبانی، ایڈووکیٹ لبنیٰ کاکڑ، ایڈووکیٹ طیبہ کاکڑ، حمیرا امنیر، ایڈووکیٹ شازیہ قریشی، ایسٹر مہک سمیت بہت سی سینئر اور نوجوان خواتین وکلاء کی طویل فہرست ہے جو انصاف کے شعبے کے لئے فخر کا باعث ہیں۔

یقیناً یہ چند نام کسی مکمل فہرست کے طور پر نہیں بلکہ بلوچستان میں اس مشکل اور اہم شعبے میں اپنی صلاحیتوں، عزم اور پیشہ ورانہ کردار کے ذریعے نمایاں خدمات انجام دینے والی خواتین وکلا کی چند نمائندہ مثالیں ہیں۔ یقیناً اس مختصر تحریر میں بہت سی ایسی باصلاحیت اور قابلِ احترام خواتین وکلا کے نام شامل نہیں ہو سکے جو خاموشی اور مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے اپنے شعبوں میں قانون اور انصاف کی خدمت کر رہی ہیں۔ اس حوالے سے جن معزز خواتین وکلا کا ذکر رہ گیا، ان سے راقم کی یہ غیر ارادی کوتاہی پیشگی معذرت کی مستحق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بلوچستان کی ہر خاتون وکیل اپنے اپنے دائرہ کار میں قانون کی سربلندی اور معاشرے میں انصاف کے فروغ کے لیے اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔

ان خواتین کی جدوجہد نہ صرف موجودہ نسل کے لیے حوصلے اور عزم کی مثال ہے بلکہ آنے والی نسلوں کی خواتین وکلا کے لیے بھی مشعلِ راہ بن رہی ہے۔ یقیناً آج کی یہ جدوجہد مستقبل میں بلوچستان کے ایک روشن، مثبت اور باصلاحیت چہرے کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کرے گی۔

تقریباً 150 خواتین کا بلوچستان میں وکالت کرنا بظاہر ایک سادہ سا عدد ہے، مگر اس کے پیچھے کئی خاندانوں، کئی ماؤں، کئی بیٹیوں اور کئی طالبات کی کہانیاں چھپی ہوئی ہیں۔ یہ وہ خواتین ہیں جنہوں نے قانون پڑھا، بار میں رجسٹریشن کرائی، عدالتوں کے چکر لگائے، سینئر وکلاء سے سیکھا، مقدمات کی تیاری کی اور ایک ایسے ماحول میں اپنی جگہ بنائی جہاں کئی دہائیوں تک اس شعبے میں مردوں کی اکثریت رہی۔

بلوچستان میں خواتین کی وکالت کے شعبے میں بڑھتی ہوئی تعداد کو صرف خواتین کی کامیابی کے طور پر نہیں دیکھنا چاہیے۔ یہ پورے معاشرے کے لیے ایک مثبت تبدیلی ہے۔ جب ایک بیٹی قانون پڑھتی ہے تو وہ صرف اپنی زندگی کا راستہ نہیں بناتی۔ وہ اپنے گھر، خاندان اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک نیا تصور بھی پیدا کرتی ہے۔ جب وہ عدالت میں کھڑی ہو کر کسی مظلوم عورت، بچے، مزدور، غریب یا کمزور شہری کا مقدمہ لڑتی ہے تو قانون کی کتاب محض کتاب نہیں رہتی، بلکہ عملی انصاف کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ بلوچستان کو ایسے ہی کرداروں کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر، انجینئر، استاد، صحافی، پولیس افسر، جج اور وکیل بننے والی بیٹیاں دراصل معاشرے کے مختلف ستون مضبوط کرتی ہیں اور شاید سب سے خوبصورت بات یہ ہے کہ آج بلوچستان کی ایک طالبہ جب سیاہ کوٹ میں کسی خاتون وکیل کو عدالت میں دیکھتی ہے تو اسے یہ سوچنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ ”کیا میں بھی وکیل بن سکتی ہوں؟“ اس کے سامنے جواب موجود ہوتا ہے۔ ”ہاں، تم بھی بن سکتی ہو“۔ بلوچستان کی عدالتوں میں بڑھتی ہوئی خواتین وکلاء کی تعداد اسی جواب کی عملی تصویر ہے۔ تقریباً 150 خواتین کا یہ سفر ابھی اختتام نہیں، بلکہ ایک نئے اور روشن دور کی ابتدا ہے۔!!!O

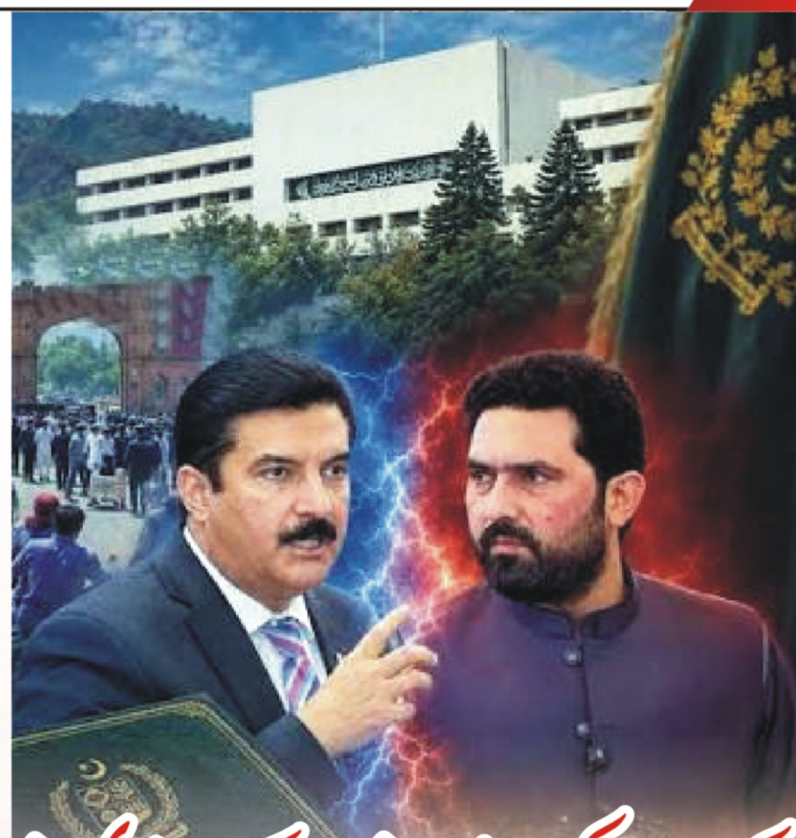

پاکستان کی سیاسی فضا ایک بار پھر شدید کشیدگی کا شکار

پی ٹی آئی کا اسلام آباد لانگ مارچ اور خیبرپختونخوا میں ایمرجنسی یا گورنر راج کی بازگشت:

معظم خان

پاکستان کی سیاسی فضا ایک بار پھر شدید کشیدگی کا شکار ہے۔ پاکستان تحریک انصاف نے اپنے اسلام آباد لانگ مارچ کی تاریخ 27 ستمبر سے مؤخر کر کے چار اکتوبر کر دی تھی اور اب یکم اکتوبر تک کی صورتحال کے مطابق پارٹی کی سیاسی کمیٹی نے اس مارچ کی حتمی منظوری دے دی ہے۔ وزیراعلیٰ خیبر پختونخوا سہیل آفریدی کی قیادت میں مارچ جنوبی اضلاع بالخصوص گنڈی چوک لکی مروت سے شروع ہونے والا ہے، پہلا پڑاؤ کرک اور دوسرا کوہاٹ میں ہوگا اس کے بعد پشاور کی طرف پیش قدمی کا منصوبہ ہے۔ وفاقی دارالحکومت میں کنٹینرز کی دیوار، ملک بھر سے پولیس فورس کی تعیناتی اور ریڈ زون کی بندش پہلے سے موجود ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ گزشتہ چند دنوں سے وفاقی وزرا اور خیبر پختونخوا کے گورنر فیصل کریم کنڈی کی زبان پر ایمرجنسی اور گورنر راج کے الفاظ بار بار آ رہے ہیں۔ وفاقی وزیر قانون اعظم نذیر تارڑ نے واضح کیا کہ اگر حالات آئینی تقاضا کریں تو صوبے میں یہ اقدامات کیے جا سکتے ہیں جبکہ گورنر نے پی ٹی آئی حکومت کو چیلنج کیا کہ وہ صرف صوابی تک پہنچ کر دکھا دیں۔ دوسری طرف پی ٹی آئی کے اندر بھی اختلافات سامنے آئے ہیں جن میں شوکت یوسفزئی کا بیرسٹر گوہر کو خط خاص طور پر اہم ہے جس میں انہوں نے مارچ ملتوی کرنے اور پارٹی کے وسیع تر مفاد میں سوچنے کی سفارش کی ہے۔ وفاقی حکومت اس وقت فوری طور پر ایمرجنسی یا گورنر راج نافذ نہ کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے اور پی ٹی آئی کو ایک اور موقع دے رہی ہے کہ وہ اپنے رویے پر نظرثانی کرے مگر پس پردہ مشاورت جاری ہے اور صدر آصف زرداری کے ساتھ بھی اہم اجلاسوں کی تیاری کی جا رہی ہے۔ یہ سب کچھ اس پس منظر میں ہو رہا ہے جہاں خیبر پختونخوا کی سیکیورٹی صورتحال کو مرکزی دلیل بنایا جا رہا ہے اور یہ سوال اٹھ رہا ہے کہ کیا وفاقی حکومت آئین کے تحت واقعی ایسا اقدام اٹھا سکتی ہے اور اس کے کیا نتائج نکل سکتے ہیں۔

اس پورے تنازعے کی جڑیں صرف ایک لانگ مارچ تک محدود نہیں بلکہ وفاقی اکائی اور صوبائی خودمختاری کے درمیان اس تاریخی کشمکش تک جاتی ہیں جو پاکستان کی سیاست کا مستقل حصہ رہی ہے۔ پی ٹی آئی اپنے کارکنوں کو عمران خان کی رہائی اور مبینہ طور پر منتخب حکومت کے مینڈیٹ کے دفاع کے لیے سڑکوں پر لانے کی تیاری کر رہی ہے جبکہ وفاقی حکومت اس کو امن و امان اور دہشت گردی کے خلاف جنگ میں صوبائی حکومت کی مبینہ ناکامی سے جوڑ رہی ہے۔ وزیراعلیٰ سہیل آفریدی عوامی مینڈیٹ کے خلاف کسی بھی اقدام کو ناقابل قبول قرار دے رہے ہیں اور مارچ کی تیاریاں جاری رکھے ہوئے ہیں جبکہ پارٹی کے کچھ حلقے اسے خطرناک مغامرت قرار دے رہے ہیں۔ اس صورتحال میں آئین کے دسویں باب کی شقیں 232 اور 234 مرکز کی توجہ کا مرکز بن گئی ہیں کیونکہ یہی وہ قانونی راستے ہیں جن کے ذریعے وفاقی حکومت صوبے کے انتظامی اور قانون ساز اختیارات عارضی طور پر اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے۔ ان شقوں کا تفصیلی جائزہ لینے سے پہلے موجودہ سیاسی صورتحال کو سمجھنا ضروری ہے کیونکہ کوئی بھی آئینی اقدام خلا میں نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے سیاسی ارادہ، سیکیورٹی تشخیص اور پارلیمانی تائید کا پیچیدہ عمل ہوتا ہے۔

پی ٹی آئی کا یہ لانگ مارچ محض ایک احتجاجی جلوس نہیں بلکہ اس کی موجودہ سیاسی بقا کی جنگ کا اہم محاذ بن چکا ہے۔ پارٹی 2022 کے بعد سے مسلسل دباؤ کا شکار ہے اور عمران خان کی قید کے بعد اس کی قیادت بیرسٹر گوہر اور صوبائی سطح پر سہیل آفریدی جیسے چہروں پر منتقل ہوگئی ہے۔ چار اکتوبر کا مارچ جنوبی خیبر پختونخوا سے شروع کر کے آہستہ آہستہ شمال کی طرف بڑھنے کا منصوبہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ پارٹی پہلے اپنے گڑھ میں طاقت کا مظاہرہ کرنا چاہتی ہے پھر اسلام آباد کی طرف پیش قدمی کرے گی۔ تاہم وفاقی حکومت کی تیاریاں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ کسی بھی بڑے پیمانے پر نقل و حرکت کو روکنے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ اسلام آباد اور راولپنڈی کی اہم شاہراہوں پر کنٹینرز، رینجرز اور پولیس کی بھاری تعیناتی اور دیگر صوبوں سے فورس کی آمد اس بات کی علامت ہے کہ حکومت مارچ کو دارالحکومت تک پہنچنے نہیں دینا چاہتی۔ اس کے ساتھ ساتھ سیکیورٹی اداروں کی رپورٹس میں خیبر پختونخوا میں دہشت گردی کے واقعات میں اضافے کا ذکر کیا جا رہا ہے اور اسے صوبائی حکومت کی کمزوری سے منسوب کیا جا رہا ہے۔ پی ٹی آئی اس الزام کو مسترد کرتی ہے اور کہتی ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ قومی سطح کا مسئلہ ہے جس میں وفاقی حکومت کی ذمہ داری بھی برابر کی ہے اور صوبے کو وسائل اور اختیارات نہیں دیے جا رہے۔

اس کشمکش کے درمیان پی ٹی آئی کے اندرونی اختلافات بھی ابھرے ہیں۔ شوکت یوسفزئی کا خط جس میں انہوں نے بیرسٹر گوہر سے مارچ ملتوی کرنے کی سفارش کی اور کہا کہ وفاقی حکومت افغانستان کی طرف سے ممکنہ حملے یا دہشت گردی کی سپورٹ کے الزام کو جواز بنا کر ایمرجنسی نافذ کر سکتی ہے اور اس کے تحت سیاست پر پابندی بھی لگ سکتی ہے، پارٹی کی صفوں میں سوچ بچار کا باعث بنا۔ یوسفزئی نے پارٹی کو ذمہ دار سیاسی جماعت ہونے کے ناطے ملک کے وسیع تر مفاد میں سوچنے کی تلقین کی۔ اس کے برعکس سہیل آفریدی اور پارٹی کی مرکزی قیادت مارچ کو آگے بڑھانے پر بضد نظر آتی ہے اور کہتی ہے کہ عوامی طاقت سے ہی وفاقی دباؤ کا مقابلہ کیا جائے گا۔ اگر ایمرجنسی یا گورنر راج لگے تو گورنر ہاؤس کے باہر دھرنا دینے کا اعلان بھی کیا گیا ہے۔ یہ داخلی تقسیم اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ پارٹی کے کچھ حلقے مارچ کے ممکنہ نتائج سے خوفزدہ ہیں جبکہ دوسرے اسے ناگزیر سمجھتے ہیں۔

اب آیئے اس بنیادی سوال کی طرف کہ وفاقی حکومت کس قانون کے تحت خیبر پختونخوا میں ایمرجنسی یا گورنر راج نافذ کر سکتی ہے۔ پاکستان کے آئین کا دسواں باب ہنگامی دفعات سے متعلق ہے اور اس میں آرٹیکل 232 اور 234 سب سے اہم ہیں۔ آرٹیکل 232 کے تحت صدر پاکستان اس بات پر مطمئن ہونے پر ایمرجنسی کا اعلان کر سکتے ہیں کہ پاکستان یا اس کے کسی حصے کی سلامتی کو جنگ، بیرونی جارحیت یا اندرونی انتشار سے ایسا خطرہ لاحق ہے جس پر قابو پانا صوبائی حکومت کے اختیار میں نہیں رہا۔ اندرونی انتشار کی صورت میں صوبائی اسمبلی کی قرارداد عام طور پر درکار ہوتی ہے مگر صدر اگر اپنے طور پر عمل کریں تو اعلان دس دن کے اندر پارلیمان کے دونوں ایوانوں کے سامنے منظوری کے لیے پیش کرنا لازمی ہوتا ہے۔ ایمرجنسی نافذ ہونے کے بعد پارلیمان متاثرہ صوبے کے لیے ایسے قوانین بنا سکتی ہے جو عام طور پر وفاقی یا متوازی فہرست میں نہ ہوں۔ وفاقی حکومت صوبے کا انتظام خود سنبھال سکتی ہے یا گورنر کو ہدایت دے سکتی ہے کہ وہ وفاقی حکومت کی طرف سے صوبائی حکومت کے تمام یا منتخب فرائض اور اختیارات سنبھالے۔ تاہم ہائی کورٹ کے اختیارات کسی صورت منتقل نہیں کیے جا سکتے۔ ایمرجنسی کا اعلان پارلیمان کے مشترکہ اجلاس کے سامنے رکھا جاتا ہے جو تیس دن کے اندر بلایا جانا چاہیے اور یہ دو ماہ بعد خود بخود ختم ہو جاتی ہے جب تک کہ مشترکہ اجلاس اسے مزید مدت کے لیے منظور نہ کرے۔ اگر مشترکہ اجلاس اکثریت سے مسترد کر دے تو ایمرجنسی فوری طور پر ختم ہو جاتی ہے۔

آرٹیکل 234 گورنر راج سے متعلق ہے اور اس کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے جب صدر کو صوبائی گورنر کی رپورٹ یا کسی اور ذریعے سے یہ اطمینان ہو جائے کہ صوبے میں ایسی صورتحال پیدا ہوگئی ہے جس میں صوبائی حکومت آئین کے مطابق کام نہیں کر سکتی۔ اس صورت میں صدر تمام اختیارات خود سنبھال سکتے ہیں یا گورنر کو ہدایت دے سکتے ہیں کہ وہ صدر کی طرف سے انہیں استعمال کرے۔ صوبائی اسمبلی کے اختیارات پارلیمان کو منتقل ہو جاتے ہیں مگر پھر بھی ہائی کورٹ کے اختیارات محفوظ رہتے ہیں۔ گورنر راج کی ابتدائی مدت دو ماہ ہوتی ہے جسے مشترکہ اجلاس دو دو ماہ کے لیے بڑھا سکتا ہے مگر کل مدت چھ ماہ سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اگر اس دوران قومی اسمبلی تحلیل ہو جائے تو گورنر راج تین ماہ تک نافذ رہ سکتا ہے جب تک نئی اسمبلی نہ آ جائے یا سینیٹ کوئی فیصلہ نہ کرے۔ آرٹیکل 236 کے تحت دسویں باب کی ان شقوں کو براہ راست عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا تاہم بنیادی حقوق کی خلاف ورزی یا دیگر آئینی شقوں کی خلاف ورزی کے الزام پر رٹ دائر کی جا سکتی ہے۔ قانونی ماہرین کا کہنا ہے کہ ماضی میں لگنے والی تقریباً تمام ایمرجنسیز اور گورنر راج کو عدالتوں میں چیلنج کیا گیا اور بعض معاملات میں عدالتوں نے ان کے دائرہ کار کو محدود کیا۔

پاکستان کی تاریخ میں گورنر راج پندرہ بار نافذ کیا جا چکا ہے۔ پنجاب، سندھ اور خیبر پختونخوا میں تین تین بار، بلوچستان میں چار بار اور مشرقی بنگال میں دو بار۔ خیبر پختونخوا میں یہ پہلی بار 16 فروری 1975 سے 3 مئی 1975 تک، دوسری بار 25 فروری 1994 سے 24 اپریل 1994 تک اور تیسری بار 12 اکتوبر 1999 سے 30 نومبر 2002 تک نافذ رہا۔ ان واقعات کا پس منظر عام طور پر سیاسی عدم استحکام، صوبائی حکومتوں کا وفاقی حکومت کے ساتھ تصادم یا سیکیورٹی چیلنجز رہا۔ 1975 میں نا سیونلسٹ عناصر کے خلاف کارروائی کا پہلو غالب تھا جبکہ 1990 کی دہائی میں سیاسی گٹھ جوڑ اور 1999 کے بعد مارشل لا کے دور میں براہ راست وفاقی کنٹرول کا عمل جاری رہا۔ ان تاریخی واقعات سے یہ سبق ملتا ہے کہ گورنر راج یا ایمرجنسی عارضی حل تو فراہم کرتے ہیں مگر طویل المدت سیاسی مسائل حل نہیں کرتے بلکہ اکثر مزید تلخی پیدا کرتے ہیں۔

موجودہ صورتحال میں وفاقی حکومت کے پاس دونوں آپشنز کھلے ہیں مگر عملی طور پر گورنر راج زیادہ آسان اور کم متنازعہ سمجھا جا رہا ہے کیونکہ اس کے لیے صوبائی اسمبلی کی قرارداد کی شرط نہیں اور گورنر کی رپورٹ کافی ہو سکتی ہے۔ تاہم صدر کی منظوری، پارلیمانی تائید اور سیاسی اتحادیوں بالخصوص پیپلز پارٹی کی حمایت ضروری ہوگی۔ پیپلز پارٹی نے ابھی تک محتاط موقف اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ آئین اور قانون کے مطابق فیصلہ کرے گی۔ اگر ایسا اقدام اٹھایا گیا تو پی ٹی آئی اسے منتخب حکومت کے خلاف سازش قرار دے گی اور گورنر ہاؤس کے باہر دھرنا یا عدالتی چارہ جوئی کا راستہ اختیار کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ صوبے میں عوامی ردعمل بھی اہم ہوگا کیونکہ خیبر پختونخوا میں پی ٹی آئی کی جڑیں مضبوط ہیں اور کوئی بھی وفاقی مداخلت کو بیرونی تسلط سمجھا جا سکتا ہے۔

سیکیورٹی صورتحال کا پہلو بھی اتنا ہی پیچیدہ ہے۔ خیبر پختونخوا دہشت گردی کے خلاف جنگ کا سب سے متاثرہ صوبہ رہا ہے اور حالیہ مہینوں میں واقعات میں اضافے کی اطلاعات ہیں۔ وفاقی حکومت کا موقف ہے کہ صوبائی حکومت اس چیلنج سے نمٹنے میں ناکام ہے جبکہ صوبائی حکومت کہتی ہے کہ وسائل کی کمی، وفاقی اداروں کے ساتھ ہم آہنگی کی کمی اور سیاسی انتقام اس کی وجوہات ہیں۔ اگر ایمرجنسی نافذ کی گئی تو وفاقی حکومت براہ راست سیکیورٹی آپریشنز چلا سکتی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ سیاسی خلا پیدا ہوگا جو مزید عدم استحکام کا باعث بن سکتا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ صرف سیکیورٹی بنیاد پر ایسا اقدام اٹھانا مشکل ہے کیونکہ آئین اندرونی انتشار کو صوبائی حکومت کے اختیار سے باہر ثابت کرنے کا تقاضا کرتا ہے اور عدالت بعد میں اس کی جانچ کر سکتی ہے۔

سیاسی سطح پر یہ بحران پاکستان کے وفاقی ڈھانچے کی کمزوریوں کو بھی عیاں کر رہا ہے۔ اٹھارہویں ترمیم کے بعد صوبوں کو زیادہ خودمختاری ملی تھی مگر ایمرجنسی دفعات اب بھی مرکز کو وسیع اختیارات دیتی ہیں۔ اگر خیبر پختونخوا میں ایسا اقدام اٹھایا گیا تو یہ دیگر صوبوں کیلئے بھی مثال بن سکتا ہے اور وفاقی اکائیوں کے درمیان اعتماد کے بحران کو گہرا کر سکتا ہے۔ پی ٹی آئی کیلئے یہ وجود کی جنگ ہے کیونکہ صوبے کی حکومت کھونے کا مطلب پارٹی کے آخری مضبوط قلعے کا خاتمہ ہوگا۔ وفاقی حکومت کے لیے یہ موقع ہے کہ وہ اپوزیشن کو دبائے مگر اسکے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سطح پر جمہوریت اور انسانی حقوق کے حوالے سے تنقید کا سامنا بھی ہو سکتا ہے۔ (باقی صفحہ 15 پر)

آئین، سیاست اور ایک صوبے کی تقدیر کا فیصلہ کن لمحہ، وفاقی حکومت کس قانون کے تحت خیبر پختونخوا میں ایمرجنسی یا گورنر راج نافذ کر سکتی ہے؟

امریکی اور برطانوی فوجیوں کا مکمل انخلا

عراق میں واشنگٹن کا اثرورسوخ برقرار رہے گا یا ایران مزید مضبوط ہوگا؟

عراق میں ایک دہائی سے زیادہ عرصے تک موجود رہنے کے بعد آخری برطانوی اور امریکی فوجی دستے بھی بدھ کو ملک چھوڑ چکے ہیں۔ برطانیہ کے باقی ماندہ فوجی اہلکاروں، جن کی تعداد تقریباً 100 تھی، کا شمالی کردستان کے علاقے اربیل سے انخلا گذشتہ ہفتوں کے دوران امریکی افواج کے ساتھ ہم آہنگی کے تحت کیا گیا۔ امریکی افواج نے بھی بدھ کے روز عراق سے رخصت اختیار کی۔ یہ پیش رفت امریکہ اور عراقی حکومت کے درمیان دو سال قبل طے پانے والے اس معاہدے کے بعد سامنے آئی ہے جس کے مطابق اس ماہ کے اختتام تک تمام غیر ملکی افواج کا انخلا مکمل کیا جانا تھا۔

برطانوی اور امریکی افواج 2014 سے عراق میں موجود تھیں اور شدت پسند تنظیم نام نہاد دولت اسلامیہ کے خلاف لڑنے کے لیے قائم بین الاقوامی اتحاد کا حصہ تھیں۔ ان کے انخلا کے ساتھ ہی 'آپریشن انہیرنٹ ریزولو' کے نام سے معروف یہ مشن بھی اختتام پذیر ہوگیا ہے۔ عراق کے وزیرِ اعظم علی الزیدی کا اس موقع پر کہنا تھا کہ اتحادی مشن کا اختتام 'عراق کے اس مرحلے میں داخل ہونے کی علامت ہے، جہاں وہ اپنی سلامتی اور استحکام کی مکمل ذمہ داری خود سنبھالتا ہے۔' افواج کے انخلا کے موقع پر عراق 'یومِ خودمختاری' کی چار تعطیلات قومی سطح پر منائے گا۔ اس سال کے آغاز میں امریکہ اور اسرائیل کی ایران کے ساتھ جنگ کے بعد سے اربیل کے فضائی اڈے پر تعینات باقی ماندہ امریکی اور برطانوی افواج کو ملیشیاؤں کی جانب سے نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ بغداد میں تعینات نیٹو کے سینکڑوں فوجی اہلکار مارچ میں ملک چھوڑ گئے تھے، جب کشیدگی میں اضافہ ہوا۔ ایران کے خلاف امریکی بمباری کی مہم کے عروج کے دوران اتحادی افواج کا یہ اڈہ روزانہ تقریباً 28 ڈرونز اور میزائل حملوں کی زد میں آرہا تھا۔ وہاں تعینات آخری برطانوی فوجی اہلکاروں میں شامل رائل ایئر فورس رجمنٹ کے گنرز نے جنگ کے پہلے چھ ہفتوں کے دوران 100 سے زیادہ ڈرونز مار گرائے تھے۔ ان حملہ آور ڈرونز میں سے بہت سے عراق میں ایران کی حمایت یافتہ ملیشیاؤں کی جانب سے لانچ کیے جارہے تھے۔ بدھ کے روز مشن کے اختتام کا اشارہ دیتے ہوئے برطانیہ کی وزارتِ دفاع نے ان برطانوی اہلکاروں کو خراجِ تحسین پیش کیا جنھوں نے نام نہاد دولت اسلامیہ کے خلاف مشن میں کردار ادا کیا تھا۔

وزارتِ دفاع کے مطابق ان اہلکاروں نے عراقی سکیورٹی فورسز کے 111,000 سے زائد ارکان کو 'قیمتی معاونت، تربیت اور مدد' فراہم کی، جن میں نیم خودمختار کردستان ریجن کی 21,000 سے زیادہ پیشمرگہ فورسز بھی شامل ہیں۔ وزارت دفاع نے یہ بھی کہا کہ رائل ایئر فورس نے عراق میں ہزاروں فضائی کارروائیاں انجام دیں اور نام نہاد دولت اسلامیہ کے 2,300 سے زیادہ اہداف کو نشانہ بنایا۔ توقع ہے کہ رائل ایئر فورس پڑوسی ملک شام کے اوپر بھی اپنی پروازیں جاری رکھے گی تاکہ نام نہاد دولت اسلامیہ کے باقی ماندہ عناصر کو دوبارہ قدم جمانے سے روکا جاسکے۔ امریکی محکمہ دفاع (پینٹاگون) نے کہا کہ امریکہ اپنے عراقی شراکت داروں کو 'مخصوص تربیت اور انٹیلی جنس معاونت' فراہم کرتا رہے گا۔

امریکی سینٹرل کمانڈ نے کہا کہ اتحادی افواج کی مشترکہ ٹاسک فورس بدستور فعال ہے اور اب اس کا مرکز اردن میں قائم ہے۔ امریکی افواج شام میں بھی نام نہاد دولت اسلامیہ کے خلاف اپنی کارروائیاں جاری رکھیں گی، جہاں اقوام متحدہ کے اندازے کے مطابق اس گروہ کے پاس اب بھی 3,000 تک جنگجو موجود ہیں۔

> برطانوی اور امریکی افواج 2014 سے عراق میں موجود تھیں اور شدت پسند تنظیم نام نہاد دولت اسلامیہ کے خلاف لڑنے کے لیے قائم بین الاقوامی اتحاد کا حصہ تھیں۔ ان کے انخلا کے ساتھ ہی 'آپریشن انہیرنٹ ریزولو' کے نام سے معروف یہ مشن بھی اختتام پذیر ہوگیا ہے

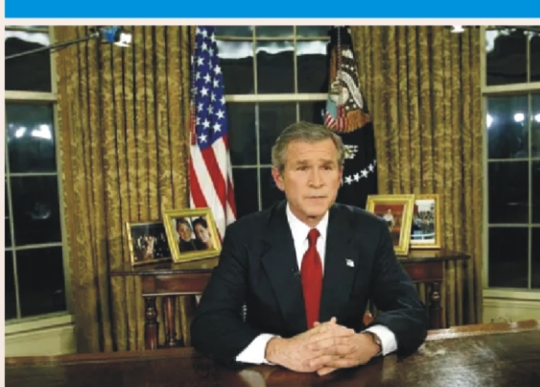

> امریکی افواج نے بھی بدھ کے روز عراق سے رخصت اختیار کی۔ یہ پیش رفت امریکہ اور عراقی حکومت کے درمیان دو سال قبل طے پانے والے اس معاہدے کے بعد سامنے آئی ہے جس کے مطابق اس ماہ کے اختتام تک تمام غیر ملکی افواج کا انخلا مکمل کیا جانا تھا۔

کیا ہو رہا ہے اور کیوں؟

سرکاری طور پر یہ انخلا واشنگٹن اور بغداد کے درمیان 2024 میں طے پانے والے اُس معاہدے کے تحت ہو رہا ہے جس کے مطابق نام نہاد دولت اسلامیہ (جسے امریکہ میں داعش بھی کہا جاتا ہے) کے خلاف امریکی قیادت میں قائم اتحادی مشن 'آپریشن ان ہیرنٹ ریزولو' ختم کیا جا رہا ہے۔ 2007 میں عراق جنگ کے عروج پر ملک میں 170,000 سے زیادہ امریکی فوجی تعینات تھے۔ امریکی مرکزی کمان کے مطابق دسمبر 2023 تک، جب انخلا کا معاہدہ طے پایا، یہ تعداد کم ہو کر تقریباً 2400 رہ گئی تھی۔

میڈیا رپورٹس کے مطابق اس کے بعد امریکی افواج نے اپنی موجودگی مزید کم کر دی اور اب صرف ایک چھوٹا دستہ خطہ کردستان میں باقی ہے۔ واشنگٹن میں اٹلانٹک کونسل کے عراق انیشی ایٹو سے وابستہ غیر مقیم سینئر فیلو صفوان الامین کہتے ہیں: 'یہ انخلا سابق عراقی حکومت کے دور میں طے پایا تھا کیونکہ عراق میں داعش کو شکست دینے کے مشن نے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔' یہ اقدام عراق کے اندر طویل عرصے سے موجود سیاسی دباؤ کی بھی عکاسی کرتا ہے۔

2016 سے 2019 تک عراق میں امریکی سفیر رہنے والے ڈگلس سلیمن کہتے ہیں کہ لگاتار عراقی حکومتوں کو امریکی فوجی موجودگی ختم کرنے کے مطالبات کا سامنا رہا ہے، کیونکہ بہت سے لوگ اسے عراقی خودمختاری میں مداخلت سمجھتے ہیں۔

سلیمن، جو اب واشنگٹن میں عرب خلیجی ریاستوں کے انسٹی ٹیوٹ کے صدر ہیں، نے گفتگو کرتے ہوئے کہا: 'ایران نواز دھڑوں اور زیادہ تر شیعہ برادری کے بعض حصوں کے دباؤ کے تحت چند عراقی حکومتیں یہ یقینی بنانے کے لیے دباؤ ڈالتی رہی ہیں کہ یہ افواج ملک چھوڑ دیں۔'

امریکی افواج نے صدر باراک اوباما کے دور میں 2011 میں عراق چھوڑا تھا، لیکن تین سال بعد بغداد کی درخواست پر واپس آئیں جب آئی ایس نے ملک کے وسیع علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد سے ان کا کردار جنگی کارروائیوں سے بدل کر تربیت، مشاورت اور انٹیلیجنس کے تبادلے تک محدود ہو گیا۔

تاہم تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ اس انخلا کا وقت باضابطہ طور پر داعش مخالف مشن کے خاتمے سے زیادہ سکیورٹی خدشات سے جڑا ہوا ہے۔ برطانیہ کے تھنک ٹینک رُوسی کے سینئر ایسوسی ایٹ فیلو ایچ اے ہیلیئر کہتے ہیں: 'یہ داعش نہیں بلکہ خطرے کا معاملہ ہے، یہ جواز تو برسوں پہلے ختم ہو چکا تھا۔' ہیلیئر شمالی عراق میں امریکی تنصیبات پر حالیہ حملوں اور ایران سے متعلق علاقائی کشیدگی کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ واشنگٹن اپنے باقی ماندہ اہلکاروں کو بڑھتے ہوئے خطرات کی زد میں سمجھنے لگا تھا۔

صفوان الامین بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ امریکی اور عراقی حکام نے پہلے اتحادی مشن کے خاتمے کے بعد بھی ایک محدود امریکی دستہ برقرار رکھنے پر بات کی تھی۔ وہ کہتے ہیں: 'فوجیوں کی کم تعداد اور طاقت کے محدود استعمال کی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے ایران جنگ نے انکی موجودگی کو اثاثے کے بجائے ایک کمزوری کے طور پر نمایاں کر دیا۔'

عراق میں امریکی میراث کیا ہے؟

حملے کے دو دہائیوں سے زیادہ عرصے بعد بھی عراق میں امریکی فوجی مداخلت کی میراث کے بارے میں آرا میں گہرا اختلاف پایا جاتا ہے۔ صفوان الامین اسے 'ملی جلی صورتِ حال' قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق: 'امریکی حملہ اپنے اہداف حاصل نہیں کر سکا اور نہ ہی رجیم کی تبدیلی عراقی عوام کے ایک مستحکم اور خوشحال ملک کے خواب پورے کر سکی۔'

(باقی صفحہ 15 پر)

بلٹ پروف گاڑیاں، بڑھتا قرض اور اشرافیہ کی مراعات: پاکستان کا معاشی دوراہا

نئی بلٹ پروف گاڑیوں کے لیے 9.6 ارب روپے: ’ایس سی او اجلاس کے بعد اِن گاڑیوں کا کیا ہوگا؟‘

پاکستان کی معیشت کا بنیادی مسئلہ صرف قرض یا آئی ایم ایف کے شرائط نہیں بلکہ ریاستی اخراجات کی ساخت، ٹیکس نیٹ کی کمزوری، ٹیکس چوری، خسارے میں چلنے والے ادارے، توانائی کے شعبے کے مسائل، پالیسیوں کا عدم تسلسل اور اشرافیہ کی مراعات کا غیر منصفانہ نظام ہے۔

شیر دل خان

پاکستان کی معیشت آج ایک ایسے نازک موڑ پر کھڑی ہے جہاں ایک طرف دن بدن بڑھتا ہوا قومی قرض، آئی ایم ایف سے نئے معاہدے، پٹرولیم مصنوعات کی بڑھتی قیمتیں، مہنگائی کی لہر، بے روزگاری اور غربت عام شہری کی زندگی کو تنگ کر رہے ہیں تو دوسری طرف ریاستی وسائل کا ایک بڑا حصہ اشرافیہ، اعلیٰ بیوروکریٹس اور سرکاری عہدے داروں کی مراعات، لگژری گاڑیوں اور شاہانہ طرز زندگی پر خرچ ہورہا ہے۔ حالیہ دنوں میں شنگھائی تعاون تنظیم (ایس سی او) کے سربراہی اجلاس کے لیے حکومتِ پاکستان کی جانب سے 45 بلٹ پروف گاڑیوں کی خریداری اور اس پر تقریباً 9.6 ارب روپے کی منظوری نے اس بحث کو ایک بار پھر شدت سے زندہ کر دیا ہے۔ وزارتِ خزانہ نے 8 ستمبر کو اعلان کیا کہ 30 بلٹ پروف گاڑیوں کے لیے 6.6 ارب روپے کی سپلیمنٹری گرانٹ منظور کی گئی جبکہ 14 ستمبر کو اقتصادی رابطہ کمیٹی نے مزید 15 بلٹ پروف سیڈان گاڑیوں کے لیے تین ارب روپے کی تکنیکی ضمنی گرانٹ کی منظوری دی۔ وفاقی حکومت کے کفایت شعاری کے اقدامات کے تحت نئی گاڑیوں کی خریداری پر پابندی عائد ہے لیکن اس خریداری کے لیے پابندی میں خصوصی نرمی حاصل کی گئی۔ حکومت کا موقف یہ ہے کہ پاکستان اس وقت ایس سی او کے کونسل آف ہیڈز آف سٹیٹ کی صدارت کر رہا ہے اور یہ اجلاس 1973 کے او آئی سی سربراہی اجلاس کے بعد پاکستان میں منعقد ہونے والا سب سے بڑا عالمی اجتماع ہوگا۔ اجلاس میں مختلف ممالک کے سربراہانِ مملکت، سربراہانِ حکومت اور بین الاقوامی تنظیموں کے اعلیٰ حکام شرکت کریں گے اس لیے سکیورٹی کے بین الاقوامی معیار کے مطابق محفوظ اور مؤثر نقل وحمل کا انتظام ناگزیر ہے۔ کابینہ ڈویژن کے پاس دستیاب جدید ترین بلٹ پروف گاڑیاں 2016 ماڈل کی ہیں جو مطلوبہ سکیورٹی معیار پر پورا نہیں اترتیں اس لیے کم از کم ضرورت کی بنیاد پر 45 گاڑیاں خریدنے کا فیصلہ کیا گیا جبکہ 300 نان بلٹ پروف گاڑیاں کرائے پر حاصل کی جائیں گی۔ حکومت کے مطابق اس موقع سے پاکستان کو عالمی برادری میں اپنا وقار مستحکم کرنے کا موقع ملے گا اور اسے سیاسی رنگ نہیں دیا جانا چاہیے۔ تاہم یہ وضاحت ان بنیادی سوالات کا جواب نہیں دیتی جو آج ہر سوچنے والے پاکستانی کے ذہن میں پیدا ہورہے ہیں۔ جب ملک قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا ہو، متعدد سرکاری ادارے ختم یا نجی کرنے کے عمل سے گزر رہے ہوں، ملازمین کی چھٹیاں ہورہی ہوں، ترقیاتی اخراجات کم کیے جارہے ہوں اور عام آدمی سے قربانی مانگی جارہی ہو تو اشرافیہ کے لیے نئی لگژری بلٹ پروف گاڑیاں خریدنے کا جواز کیا ہے؟ موجودہ گاڑیوں کو اپ گریڈ کیوں نہیں کیا جا سکتا تھا؟ خریداری کے بعد ان گاڑیوں کا کیا ہوگا؟ کیا یہ گاڑیاں صرف اجلاس تک محدود رہیں گی یا پھر مستقل طور پر اعلیٰ عہدے داروں کے استعمال میں آجائیں گی؟ یہ سوالات صرف سوشل میڈیا تک محدود نہیں بلکہ پارلیمانی نگرانی، شفافیت اور عوامی احتساب کے دائرے میں بھی آتے ہیں۔ سپلیمنٹری گرانٹ اور ایمرجنسی سیکیورٹی انتظامات کے نام پر بار بار ایسی خریداریاں ہوتی رہی ہیں جن پر عوامی یا پارلیمانی نگرانی نہ ہونے کے برابر ہے۔ جب ریاست خود کفایت شعاری کی بات کرتی ہے تو اسے سب سے پہلے اپنے اوپر لاگو کرنا چاہیے نہ کہ صرف نچلے اور متوسط طبقات پر۔ یہی وہ بنیادی تضاد ہے جو آج پاکستان کی معاشی اور سیاسی بحث کا مرکز بن چکا ہے۔

سوشل میڈیا پر اس خریداری پر ملے جلے مگر اکثر تنقیدی تبصرے سامنے آئے ہیں۔ سابق سینیٹر مشاہد حسین سید نے لکھا کہ ایس سی او کے صرف دس اراکین ہیں اور انڈیا سمیت نو ممالک کے رہنماؤں کے لیے 45 لگژری گاڑیاں خرید کر 9 ارب 60 کروڑ روپے ضائع کیے جا رہے ہیں۔ علی ارقم نے حکومت کی کفایت شعاری کی مہم پر طنز کرتے ہوئے پوچھا کہ اجلاس ختم ہونے کے بعد ان گاڑیوں کا کیا ہوگا اور ریاست ان اخراجات کو کس طرح منظور کرتی ہے جبکہ عوامی یا پارلیمانی نگرانی کتنی ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایسی خریداریوں کے لیے سپلیمنٹری گرانٹ اور ایمرجنسی سیکیورٹی کا راستہ اختیار کیا جاتا رہا ہے اور نئی گاڑیوں پر پابندی سے خصوصی استثنا بھی مانگا گیا۔ حسین یعقوب نے لکھا کہ سکیورٹی اہم ہے لیکن عوام کا پیسہ بھی اتنا ہی اہم ہے اس لیے سکیورٹی خطرات کے جائزے کی تفصیلات، موجودہ گاڑیوں کے عدم استعمال کی وجوہات اور خریداری کی شرائط وضوابط عوام کے سامنے آنی چاہییں۔ حسنین رفیق نے کہا کہ ٹیکس دیتے دیتے اور مہنگائی برداشت کرتے کرتے عوام مرگئی ہے ہمیں سفارتی کامیابیوں کی کہانیاں نہ سنائیں بلکہ بتائیں کہ گذشتہ برسوں میں عام آدمی کو کیا ملا۔

یہ تبصرے محض جذباتی ردعمل نہیں بلکہ ایک گہرے معاشرتی اور معاشی [illegible] کی عکاسی کرتے ہیں۔ ایک طرف عام شہری بجلی کے بل، گیس کے نرخ، پٹرول کی قیمتیں، خوراک کی مہنگائی اور علاج کی بڑھتی لاگت سے نبرد آزما ہے تو دوسری طرف سرکاری افسران کے پاس ایک نہیں دو دو گاڑیاں موجود ہیں، رہائش، علاج، سفری سہولتیں اور دیگر مراعات کا دائرہ وسیع ہوتا جارہا ہے۔ بہت سے ادارے ختم یا نجی کیے جارہے ہیں جبکہ چھوٹے ملازمین بے روزگار ہو رہے ہیں لیکن اشرافیہ کی مراعات میں کوئی کمی نہیں آرہی بلکہ مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔ یہی وہ دوغلا پن ہے جو ریاست کے اعتماد کو کمزور کر رہا ہے۔ جب حکومت عوام سے قربانی مانگتی ہے تو اسے خود بھی قربانی کی مثال قائم کرنی چاہیے۔ ریاستی عہدہ سہولت کا حق دے سکتا ہے لیکن شاہانہ طرز زندگی کا لامحدود حق نہیں دیتا۔ موجودہ معاشی بحران میں یہ اصول مزید اہم ہو جاتا ہے کیونکہ ریاستی وسائل لامحدود نہیں۔ جو رقم غیر ضروری یا غیر مؤثر اخراجات میں جاتی ہے وہ بالآخر ٹیکس، مہنگائی، کم ترقیاتی اخراجات یا مزید قرض کی صورت میں عوام تک پہنچتی ہے۔ پاکستان کا قرض دن بدن بڑھ رہا ہے حکومت آئی ایم ایف سے نئے معاہدے کر رہی ہے لیکن اشرافیہ کی لگژری پر کوئی روک نہیں۔ یہ صورتحال صرف موجودہ حکومت تک محدود نہیں بلکہ مختلف ادوار میں چلتی آرہی ہے جہاں طاقتور طبقات کے لیے مراعات کا نظام تقریباً مقدس سمجھا جاتا رہا ہے۔ اب وقت آ[illegible] کیا ہے وہ اس نظام پر [illegible] عام سوال اٹھائے جائیں [illegible] اسے شفافیت اور جواب دہی کے دائرے میں لایا جائے۔

پاکستان کی معیشت کا بنیادی مسئلہ صرف قرض یا آئی ایم ایف کے شرائط نہیں بلکہ ریاستی اخراجات کی ساخت، ٹیکس نیٹ کی کمزوری، ٹیکس چوری، خسارے میں چلنے والے ادارے، توانائی کے شعبے کے مسائل، پالیسیوں کا عدم تسلسل اور اشرافیہ کی مراعات کا غیر منصفانہ نظام ہے۔ سرکاری عہدے داروں، اعلیٰ انتظامی افسران، ارکان پارلیمان اور دیگر بااثر طبقات کے لیے تنخواہوں، پنشن، سرکاری گاڑیوں، رہائش، علاج اور سفری سہولتوں کے مختلف پیکیجز موجود رہے ہیں۔ ان میں سے بہت سی سہولتوں کا جواز انتظامی ضرورت سے وابستہ ہوسکتا ہے لیکن معاشی بحران کے زمانے میں ہر مراعات کو اسی شکل میں برقرار رکھنا ضروری نہیں۔ ریاستی وسائل عوام کی امانت ہیں اور ان کے استعمال میں کفایت، شفافیت اور جواب دہی محض اخلاقی تقاضا نہیں بلکہ معاشی ضرورت بھی ہے۔ سب سے پہلے تمام سرکاری مراعات کی مکمل فہرست عوام کے سامنے آنی چاہیے۔ کون سا عہدہ کتنی تنخواہ لیتا ہے، کتنی سرکاری گاڑیاں استعمال ہوتی ہیں، سرکاری رہائش پر کتنا خرچ آتا ہے، علاج اور سفری سہولتوں پر سالانہ کتنی رقم خرچ ہوتی ہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد کون سی سہولتیں جاری رہتی ہیں یہ سب معلومات عوام سے پوشیدہ نہیں ہونی چاہییں۔ اس کے بعد مراعات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: ضروری، قابلِ جواز مگر قابلِ اصلاح اور غیر ضروری۔ ضروری سہولتیں برقرار رہیں، انتظامی ضرورت سے متعلق مراعات میں کفایت شعاری لائی جائے جبکہ ایسی مراعات جو محض عہدے کے وقار یا روایت کے نام پر جاری ہیں انہیں مرحلہ وار ختم کیا جائے۔ کفایت شعاری کا آغاز صرف نچلے یا متوسط طبقے سے نہیں ہونا چاہیے۔ اگر حکومت عوام سے ٹیکس مانگتی ہے تو اسے اپنے اخراجات کے بارے میں بھی جواب دینا ہوگا۔ اگر بجلی مہنگی ہوتی ہے تو سرکاری اداروں کی توانائی کے استعمال کا حساب بھی ہونا چاہیے۔ اگر عام شہری سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے اخراجات کم کرے تو ریاستی اداروں کو بھی یہی اصول اپنانا ہوگا۔ ایس سی او اجلاس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن اس کے نام پر 9.6 ارب روپے کی بلٹ پروف گاڑیاں خریدنا اور پھر ان کے مستقبل کے بارے میں واضح منصوبہ نہ ہونا سوالات پیدا کرتا ہے۔ کیا ان گاڑیوں کو بعد میں اعلیٰ عہدے داروں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے گا؟ کیا ان کی دیکھ بھال اور ایندھن کا خرچ بھی عوام کے ٹیکس سے ہوگا؟ کیا موجودہ گاڑیوں کو جدید بنانے یا کرائے پر حاصل کرنے کے متبادل پر غور کیا گیا؟ ان سوالات کے جوابات کے بغیر حکومت کی وضاحت ادھوری رہتی ہے۔ پاکستان کو اب ایسی حکمرانی کی ضرورت ہے جہاں اقتدار کا مطلب مراعات نہیں بلکہ ذمہ داری ہو جہاں سرکاری منصب سہولت کا ذریعہ نہیں بلکہ عوامی خدمت کا عہد سمجھا جائے اور جہاں معاشی بحران کا بوجھ صرف عام آدمی کے کندھوں پر نہ ڈالا جائے۔

قرض میں ڈوبا ہوا پاکستان صرف نئے قرضوں سے نہیں بلکہ پرانے طرز حکمرانی کو بدل کر ہی قرض کے بوجھ سے نکل سکتا ہے۔ اس تبدیلی کا پہلا اصول بہت سادہ ہے: ریاست جس سے قربانی مانگتی ہے اسے خود بھی قربانی کی مثال قائم کرنی ہوگی۔ اشرافیہ کی مراعات کا خاتمہ یا اصلاح اسی بڑے عمل کا ایک حصہ ہونا چاہیے۔ اس کا مقصد کسی طبقے کو نشانہ بنانا نہیں بلکہ یہ اصول قائم کرنا ہے کہ ریاست کے وسائل عوام کی امانت ہیں۔ جس ملک میں کروڑوں لوگ اپنی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہوں وہاں ریاستی وسائل کے استعمال میں کفایت، شفافیت اور جواب دہی لازمی ہے۔ عام پاکستانی پہلے ہی قربانی دے رہا ہے وہ ٹیکس ادا کرتا ہے مہنگائی برداشت کرتا ہے بجلی اور گیس کے بڑھتے ہوئے بل ادا کرتا ہے اور اپنے محدود وسائل میں خاندان کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب ریاستی نظام کو بھی یہ ثابت کرنا ہوگا کہ قربانی صرف عوام کا مقدر نہیں۔ بلٹ پروف گاڑیوں کی خریداری کا معاملہ صرف ایک واقعہ نہیں بلکہ ایک علامت ہے۔ یہ علامت بتاتی ہے کہ جب تک طاقتور طبقات کے لیے مراعات کا نظام جوں کا توں رہے گا معاشی اصلاحات ادھوری رہیں گی اور عوام کا اعتماد کمزور ہوتا جائے گا۔ پاکستان کو اب جذباتی نہیں بلکہ شفاف اور اعداد وشمار پر مبنی پالیسی بنانی ہوگی جہاں ہر روپیہ خرچ کرنے کا جواز موجود ہو اور ہر عوامی عہدے دار اپنے مالی اختیارات کے لیے جواب دہ ہو۔ صرف تب ہی ملک قرض کے بوجھ سے نکل سکتا ہے مہنگائی پر قابو پا سکتا ہے اور حقیقی معنوں میں ترقی کی راہ پر گامزن ہوسکتا ہے۔ یہ تبدیلی آسان نہیں لیکن ناگزیر ہے۔

کوہاٹ سول لائنز حملہ:

دشمن دہشت گردی کے محاذ کو وسعت دے رہا ہے

بھارت اسرائیل تزویراتی اتحاد پاکستان کی سلامتی کیلئے خطرہ ہے

بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) صادق راہی
ستارہ امتیاز (ملٹری)

کوہاٹ کی پرانی پولیس لائنز کے قریب جمعہ کی نماز کے دوران مسجد کے باہر ہونے والا دہشت گرد حملہ ایک ایسے وقت میں ہوا جب خیبر پختونخوا ایک بار پھر دہشت گردی کے شدید دباؤ کا سامنا کر رہا ہے، بلوچستان میں ریاست مخالف مسلح عناصر کے خلاف کارروائیاں جاری ہیں اور افغانستان سے سرگرم دہشت گرد تنظیموں کے مسئلے پر پاکستان اور کابل کے درمیان کشیدگی خطرناک حد تک بڑھ چکی ہے۔

کوہاٹ میں بارود سے بھری گاڑی پولیس لائنز کے گیٹ سے ٹکرائی، جس کے بعد شدید دھماکہ ہوا اور دہشت گرد پولیس کمپاؤنڈ میں داخل ہوگئے۔ مسجد کا بیرونی حصہ متاثر ہوا، دیوار گر گئی اور قریبی عمارتوں کو بھی نقصان پہنچا۔ حملے کے دوران فائرنگ اور مزید خودکش دھماکوں کا سلسلہ جاری رہا۔ 21 افراد، جن میں 15 پولیس اہلکار شامل تھے، کی شہادت اور 103 افراد کے زخمی ہونے کی اطلاع ہے۔ پولیس کے مطابق سات مسلح دہشت گرد کمپاؤنڈ میں داخل ہوئے، جن کا پولیس اور انسداد دہشت گردی کے اہلکاروں نے بھرپور مقابلہ کیا اور دہشت گردوں کو جہنم واصل کیا۔ یہ حملہ اپنی نوعیت میں غیر معمولی تھا۔ دہشت گردوں نے بیک وقت مسجد، پولیس لائنز، نمازیوں اور قانون نافذ کرنے والے ادارے کو نشانہ بنایا۔ گویا مقصد صرف جانی نقصان نہیں بلکہ ریاستی رٹ، عوامی اعتماد اور امن کے احساس کو ایک ہی وار میں مجروح کرنا تھا۔

پاکستان گزشتہ کئی برس سے عالمی برادری کو مسلسل آگاہ کر رہا ہے کہ تحریک طالبان پاکستان، جسے پاکستان میں فتنہ الخوارج کہا جاتا ہے، افغانستان میں موجود محفوظ پناہ گاہوں سے پاکستان کے خلاف کارروائیاں کر رہی ہے۔

اب یہ معاملہ محض پاکستانی موقف تک محدود نہیں رہا۔ اقوام متحدہ کی تازہ نگرانی کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ افغانستان میں TTP کو افغان حکام کی جانب سے زیادہ آزادی اور حمایت حاصل ہوئی اور اس کے نتیجے میں پاکستان کے خلاف اس کے حملوں میں اضافہ ہوا۔ اقوام متحدہ کے ایک اور فورم پر پاکستان نے واضح کیا کہ افغانستان میں TTP اور دیگر دہشت گرد گروہوں کو محفوظ پناہ گاہیں میسر ہیں جہاں سے پاکستان کے خلاف حملوں کی منصوبہ بندی، تربیت اور کارروائیاں کی جاتی ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ پاکستان نے بارہا کابل سے مطالبہ کیا ہے کہ اپنی سرزمین پاکستان کے خلاف استعمال نہ ہونے دی جائے۔ قطر، ترکیہ، سعودی عرب اور دیگر دوست ممالک نے بھی پاکستان اور افغانستان کے درمیان کشیدگی کم کرنے اور دہشت گردی کے مسئلے کے حل کے لیے سفارتی کوششیں کیں۔ مگر اگر مذاکرات، رابطوں اور ثالثی کے باوجود پاکستان پر حملے جاری رہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر پاکستان کب تک صرف احتجاج کرتا رہے؟

افغانستان سے دہشت گردی کا مسئلہ اب براہ راست پاکستان کی سلامتی کا مسئلہ ہے۔ افغان حکومت پاکستان کے الزامات کو مسترد کرتی رہی ہے، لیکن زمینی صورت حال کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کسی ملک کی سرزمین سے ایک دہشت گرد تنظیم مسلسل پڑوسی ملک کی پولیس، فوج، شہریوں اور حساس تنصیبات کو نشانہ بنائے تو معاملہ محض دوطرفہ اختلافات کا نہیں رہتا۔ یہ براہ راست قومی سلامتی کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ پاکستان نے اس حوالے سے اقوام متحدہ میں بھی اپنا مقدمہ پیش کیا ہے۔ جون 2026 میں سلامتی کونسل کے اجلاس میں پاکستانی نمائندے نے کہا کہ افغانستان میں TTP، بی ایل اے اور دیگر گروہوں کو محفوظ پناہ گاہیں حاصل ہیں اور وہاں سے پاکستان کے خلاف سرحد پار حملے کیے جا رہے ہیں۔ ستمبر 2026 کے تازہ اجلاس میں بھی پاکستان نے افغانستان میں دہشت گرد گروہوں کی موجودگی اور پاکستان کے خلاف کارروائیوں پر شدید تحفظات کا اظہار کیا۔ لہٰذا کوہاٹ کے واقعے کو صرف مقامی دہشت گردی قرار دے کر آگے بڑھ جانا پاکستان کے قومی مفاد میں نہیں۔

بلوچستان کا محاذ بھی اسی وقت کیوں متحرک ہے؟

کوہاٹ سانحے کے ساتھ ہی بلوچستان میں بھی سکیورٹی فورسز کی کارروائیاں جاری تھیں۔ 18 ستمبر کو سرکاری ذرائع کے مطابق پنجگور کے علاقے فتح علی میں پانچ اور ضلع کچھی کے علاقے ڈھاڈر میں دو دہشت گرد ہلاک کیے گئے جبکہ اسلحہ اور گولہ بارود بھی برآمد ہوا۔ بعدازاں بلوچستان میں فتنہ الہندوستان کے خلاف مزید کارروائیوں میں 11 دہشت گردوں کی ہلاکت کی اطلاع بھی سامنے آئی۔

یہ بظاہر دو مختلف جغرافیائی محاذ ہیں لیکن ان کے منفی اثرات مسلئے کی شدت میں اضافہ کرتے ہیں۔ ایک طرف خیبر پختونخوا میں افغانستان سے جڑے دہشت گرد نیٹ ورک کا چیلنج ہے، دوسری طرف بلوچستان میں ریاست مخالف مسلح تنظیموں کا مسئلہ۔ پاکستان طویل عرصے سے یہ موقف اختیار کرتا آیا ہے کہ بلوچستان میں بعض دہشت گرد تنظیموں کو بیرونی سرپرستی، مالی معاونت اور سہولت کاری حاصل ہے اور اس حوالے سے بھارت پر الزامات عائد کرتا ہے۔ بھارت ان الزامات کو مسترد کرتا ہے۔ لیکن پاکستان کے لیے اس خطرے کو نظرانداز کرنا ممکن نہیں۔

بھارت اور اسرائیل: ایک کھلا تزویراتی اتحاد

یہاں بھارت اور اسرائیل کے تعلقات کو بھی علاقائی سلامتی

کے وسیع تر تناظر میں دیکھنا ہوگا۔ فروری 2026 میں بھارت اور اسرائیل نے اپنے تعلقات کو باقاعدہ طور پر خصوصی تزویراتی شراکت داری کی سطح تک بلند کیا۔ دونوں ممالک نے دفاع، سلامتی، سائبر سلامتی، مصنوعی ذہانت، اہم اور ابھرتی ہوئی ٹیکنالوجی، خلائی شعبے اور دیگر اسٹریٹجک میدانوں میں تعاون بڑھانے کا اعلان کیا۔ یہ کوئی خفیہ تعلق نہیں۔ خود دونوں حکومتیں اسے کھلے عام تزویراتی شراکت داری قرار دے رہی ہیں۔ پاکستان کے لیے سوال یہ نہیں کہ بھارت اسرائیل سے تعاون کیوں کر رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس بڑھتے ہوئے دفاعی اور تکنیکی تعاون سے بھارت کی مجموعی صلاحیتیں کس حد تک بڑھ رہی ہیں اور پاکستان کے سلامتی کے ماحول پر اس کے کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ جب افغانستان میں پاکستان مخالف دہشت گرد گروہوں کی موجودگی، بھارت کی افغانستان میں بڑھتی ہوئی سفارتی و معاشی سرگرمیاں اور بلوچستان میں بیرونی معاونت کے پاکستانی الزامات سامنے ہوں تو پاکستان کے لیے ان تمام عوامل کو ایک وسیع تزویراتی منظرنامے میں دیکھنا ناگزیر ہے۔

یہ تین الگ کہانیاں نہیں

افغانستان، بھارت اور اسرائیل کے بارے میں ہر دعوے کو ایک ہی مشترکہ خفیہ منصوبے کا حتمی ثبوت قرار دینا شاید درست طرزِ تجزیہ نہ ہو؛ لیکن یہ بھی درست نہیں کہ ان تمام سرگرمیوں کو ایک دوسرے سے مکمل طور پر غیر متعلق سمجھ لیا جائے۔ پاکستان کی سلامتی کے نقطہ نظر سے اہم بات نتیجہ ہے۔ افغان سرزمین سے TTP کا خطرہ موجود ہے۔ بلوچستان میں ریاست مخالف دہشت گردی موجود ہے۔ پاکستان بھارت پر بعض پراکسی گروہوں کی معاونت کے الزامات عائد کرتا ہے۔ اور بھارت اسرائیل کے ساتھ دفاعی، سلامتی اور جدید ٹیکنالوجی کے شعبوں میں اپنی شراکت داری مسلسل گہری کر رہا ہے۔ یہ تمام حقائق پاکستان کے لیے ایک پیچیدہ اور کثیرالجہتی سلامتی کا ماحول پیدا کرتے ہیں۔

پاکستان کے پاس اب صرف ایک راستہ ہے اور وہ ہے، مضبوط قومی ردعمل۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ صرف فوج یا پولیس کی جنگ نہیں۔ کوہاٹ کے شہداء میں 15 پولیس اہلکاروں کی قربانی ہمیں یاد دلاتی ہے کہ ہماری پولیس بھی ہر روز قومی سلامتی کی اگلی صف میں کھڑی ہے۔ پولیس لائنز جیسی حساس تنصیبات کی حفاظت کے لیے جدید نگرانی، مضبوط حفاظتی حصار، بروقت انٹیلی جنس تبادلہ، فوری ردعمل اور دہشت گردوں کے سہولت کاروں تک رسائی ضروری ہے۔ مگر اصل جنگ صرف حملہ آور کو مارنے سے ختم نہیں ہوتی۔ اس کے پیچھے موجود منصوبہ ساز، مالی معاون، سہولت کار، اسلحہ فراہم کرنے والے، سرحد پار رابطے اور مواصلاتی نیٹ ورک بھی ریاست کی گرفت میں آنے چاہئیں۔

پاکستان کو دہشت گردی کے خلاف ایک جامع قومی حکمت عملی کے ساتھ ساتھ سفارتی محاذ پر بھی واضح اور دوٹوک مو?قف اختیار کرنا ہوگا۔ دنیا کو یہ بات سمجھنی ہوگی کہ پاکستان کسی دوسرے ملک کی خودمختاری میں مداخلت نہیں چاہتا، مگر پاکستان کی خودمختاری کا احترام بھی لازم ہے۔ اگر افغان سرزمین پاکستان کے خلاف استعمال ہو رہی ہے تو عالمی برادری کو کابل پر واضح دباؤ ڈالنا ہوگا۔ اگر پاکستان کے خلاف بیرونی پراکسیز استعمال ہو رہی ہیں تو ان کے سرپرستوں کو عالمی سطح پر جواب دینا ہوگا۔ اور اگر کوئی ریاست پاکستان کے داخلی معاملات میں مداخلت کرتی ہے تو اسلام آباد کو اس معاملے کو ہر عالمی فورم پر پوری قوت سے اٹھانا ہوگا۔

خیبر پختونخوا کے عوام نے دہشت گردی کے خلاف سب سے بھاری قیمت ادا کی ہے۔ پولیس اہلکاروں نے محدود وسائل کے باوجود اپنی جانیں قربان کر کے ریاست اور شہریوں کے تحفظ کا فرض نبھایا ہے۔ کوہاٹ کے شہداء کے اہل خانہ کو صرف تعزیتی بیانات نہیں، ریاست کی عملی سرپرستی چاہیے۔

ان کے بچوں کی تعلیم، خاندانوں کی مالی کفالت اور مستقبل کا تحفظ ریاست کی ذمہ داری ہے۔ لیکن ان شہداء کی تب بامعنی ہوگی جب ریاست دہشت گردی کے پورے نیٹ ورک کو توڑے گی۔ کوہاٹ ہمیں یہ پیغام دے رہا ہے کہ دہشت گردی اب کسی ایک ضلع، صوبے یا ادارے کا مسئلہ نہیں، یہ پاکستان کی قومی سلامتی، خودمختاری اور ریاستی استحکام کا مسئلہ ہے۔ دشمن چاہے سرحد پار پناہ گاہ سے آئے، کسی پراکسی کے ذریعے آئے یا کسی بیرونی نیٹ ورک کی معاونت سے — پاکستان کو اسے سخت جواب دینا ہوگا کہ ریاستِ پاکستان اپنی سرزمین، اپنے شہریوں اور اپنی خودمختاری کے دفاع کا حق رکھتی ہے اور اس حق کے استعمال میں کسی دباؤ کو رکاوٹ نہیں بننے دے گی۔ کوہاٹ کے شہداء کا خون ہم سے کمزور ردعمل نہیں، قومی اتحاد، مضبوط ریاستی عزم اور فیصلہ کن انسدادِ دہشت گردی کا تقاضا کرتا ہے۔

☆......☆

مشرق
کہانی میگزین

انتخاب	ساجد خان
گرافکس	خرم شہزاد

شادی بیاہ کے موقع پر خواتین کا سجنا اور سنورنا

ایمان کامران

شادی بیاہ کے موقع پر خواتین کو ایسے سجنا اور سنورنا چاہیے کہ ان کی خوبصورتی اور وقار دونوں نمایاں ہوں۔ روایتی اور شاندار لباس جیسے لہنگا، ساری، غرارہ یا شرارہ پہنیں جو رنگ برنگے، بھاری کڑھائی والے اور میچنگ دوپٹے کے ساتھ ہوں تاکہ پورے ماحول میں چمک پیدا ہو۔ میک اپ ہلکا مگر پرکشش رکھیں —— چمکدار آنکھیں، قدرتی گلابی گال اور خوبصورت لپ کلر کے ساتھ چہرے کو تازگی بخشیں، جبکہ بالوں کو خوبصورت اسٹائل، گجرا یا پھولوں سے سجائیں تاکہ روایتی دلکشی بڑھے۔ زیورات میں سونے کے بھاری ہار، جھمکے، چوڑیاں اور مہندی سے سجی انگلیاں شامل کریں جو لباس کے ساتھ ہم آہنگ ہوں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ لباس اور میک اپ میں اعتماد اور خوشی جھلکے تاکہ دلہن یا مہمان ہونے کے ناطے آپ کی موجودگی یادگار اور دلکش بن جائے۔

مشرق
کہانی میگزین

انتخاب ساجد خان
گرافکس خرم شہزاد

شادی بیاہ کے موقع پر خواتین کا سجنا اور سنورنا

ایمان کامران

شادی بیاہ کے موقع پر خواتین کو ایسے سجنا اور سنورنا چاہیے کہ ان کی خوبصورتی اور وقار دونوں نمایاں ہوں۔ روایتی اور شاندار لباس جیسے لہنگا، ساری، غرارہ یا شرارہ پہنیں جو رنگ برنگے، بھاری کڑھائی والے اور میچنگ دوپٹے کے ساتھ ہوں تاکہ پورے ماحول میں چمک پیدا ہو۔ میک اپ ہلکا مگر پرکشش رکھیں —— چمکدار آنکھیں، قدرتی گلابی گال اور خوبصورت لپ کلر کے ساتھ چہرے کو تازگی بخشیں، جبکہ بالوں کو خوبصورت اسٹائل، گجرا یا پھولوں سے سجائیں تاکہ روایتی دلکشی بڑھے۔ زیورات میں سونے کے بھاری ہار، جھمکے، چوڑیاں اور مہندی سے سجی انگلیاں شامل کریں جو لباس کے ساتھ ہم آہنگ ہوں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ لباس اور میک اپ میں اعتماد اور خوشی جھلکے تاکہ دلہن یا مہمان ہونے کے ناطے آپ کی موجودگی یادگار اور دلکش بن جائے۔

کیا انڈے کی زردی کھانے سے دل کے دورے کا خطرہ بڑھتا ہے اور ایک دن میں کتنے انڈے کھانے چاہییں؟

......عطاء محمد کاکڑ......

دنیا بھر میں انڈوں کو صحتمند غذا کے طور پر جانا جاتا ہے۔ تاہم، اِن کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں اب بھی کئی سوالات موجود ہیں۔ کیا مرغی کے انڈے کھانے سے کولیسٹرول بڑھتا ہے؟ ایک دن میں کتنے انڈے کھائے جا سکتے ہیں؟ دیسی مرغی کے انڈے بہتر ہیں یا برائلر مرغی کے؟ کیا کچے انڈے کھائے جاسکتے ہیں؟ ایسے کئی سوالات ہیں۔ آیئے جانتے ہیں کہ ان سوالات کے بارے میں ماہرِ غذائیت کیا کہتے ہیں۔

انڈوں میں کون سے غذائی اجزا ہوتے ہیں؟

ماہرِ غذائیات ڈاکٹر ارون کمار بتاتے ہیں کہ ایک انڈے میں اوسطاً 60 کیلوریز ہوتی ہیں اور اس میں چھ گرام اعلیٰ معیار کا پروٹین ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ 'انڈوں میں موجود پروٹین کو اعلیٰ معیار کا اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ آسانی سے ہضم ہو جاتا ہے۔' اسی وجہ سے دیگر غذاؤں میں موجود پروٹین کے فوائد کا جائزہ لیتے وقت انڈے کے پروٹین کو معیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے انڈے کے پروٹین کو 'گولڈ سٹینڈرڈ' سمجھا جاتا ہے۔

کیا انڈے کی زردی جسم کے لیے نقصان دہ ہے؟

لوگوں میں عام تاثر یہ ہے کہ صرف انڈے کی سفیدی ہی جسم کے لیے اچھی ہوتی ہے، لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ سفیدی اور زردی دونوں میں پروٹین موجود ہوتا ہے، صرف سفیدی میں ہی پروٹین نہیں ہوتا۔ زردی میں کولین ہوتا ہے، جو دماغی اور اعصابی نظام کے لیے ایک اہم غذائی جز ہے۔ حاملہ خواتین اور رحم میں موجود بچے کے لیے یہ ایک بہت اہم غذائی جزو ہے۔ اس میں لیوٹین اور زیکسینتھین جیسے غذائی اجزا بھی ہوتے ہیں، جو اعصابی نظام اور آنکھوں کی صحت کے لیے ضروری ہیں۔ اس کے علاوہ، انڈوں میں وٹامن ڈی جیسے غذائی اجزا بھی پائے جاتے ہیں۔ نیشنل سینٹر فار بائیوٹیکنالوجی انفارمیشن (این سی بی آئی) کی ایک تحقیق اس کی تصدیق کرتی ہے، جس کے مطابق مرغی کے انڈے کولین، فولیٹ، وٹامن ڈی، آئیوڈین، بی وٹامنز اور اعلیٰ معیار کے پروٹین کا ذریعہ ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ صحت سے متعلق قومی ادارے اس وقت انڈوں کو زیادہ کولیسٹرول اور دل سے متعلق بیماریوں کے خطرے کا سبب نہیں سمجھتے۔

ایک دن میں کتنے انڈے کھا سکتے ہیں؟

عالمی ادارہ صحت کے مطابق، چھ ماہ کی عمر سے بچوں کی غذا میں انڈے شامل کیے جاسکتے ہیں۔

چھوٹے بچوں کے لیے: ایک سے دو انڈے

حاملہ خواتین کے لیے: دو انڈوں تک

بزرگوں کے لیے: کولین کی ضرورت پوری کرنے کے لیے دو انڈے

ایسے افراد جو زیادہ ورزش کرتے ہیں اور جنھیں اضافی پروٹین درکار ہوتا ہے: روزانہ تین سے چار انڈے کھا سکتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ آسانی سے روزانہ ایک سے دو انڈے کھا سکتے ہیں۔ یہاں دو انڈوں سے مراد زردی سمیت مکمل انڈے ہیں۔

کیا انڈے کی زردی کھانے سے دل کا دورہ پڑ سکتا ہے؟

کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ انڈے کی زردی میں کولیسٹرول زیادہ ہوتا ہے، جو خون کی نالیوں میں جمع ہو کر دل کا دورہ پڑنے کا سبب بن سکتا ہے، لیکن ڈاکٹر ارون کمار کا کہنا ہے کہ اس معاملے کو سمجھنا ضروری ہے۔ وہ کہتے ہیں: 'یہ درست ہے کہ ایک انڈے کی زردی میں تقریباً 200 ملی گرام کولیسٹرول ہوتا ہے، لیکن غذا سے حاصل ہونے والے کولیسٹرول اور خون میں موجود کولیسٹرول کے تعلق کو سمجھنا اہم ہے۔' 'یہ ایک غلط تصور ہے کہ خون میں موجود تمام کولیسٹرول صرف خوراک سے آتا ہے۔ ان کے مطابق، روزانہ کولیسٹرول کی تجویز کردہ مقدار دو ہزار ملی گرام ہے، جو تقریباً 10 انڈوں میں پائی جانے والی مقدار کے برابر ہے۔' جسم خود بھی جگر میں کولیسٹرول بناتا ہے۔

ڈاکٹر ارون کمار کہتے ہیں: 'جب کوئی شخص روزانہ دو انڈے کھاتا ہے اور ان سے 400 ملی گرام کولیسٹرول حاصل کرتا ہے تو جگر کی طرف سے کولیسٹرول بنانے کی مقدار دو ہزار ملی گرام سے کم ہو جاتی ہے۔' کولیسٹرول صرف انڈوں میں ہی نہیں بلکہ دودھ سے بنی مصنوعات اور گوشت والی غذاؤں میں بھی ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: 'اگر چہ خون میں ایل ڈی ایل کولیسٹرول کی زیادہ مقدار کو دل کے دورے کا سبب سمجھا جاتا ہے، لیکن اس تعلق کے بارے میں بحث اب بھی جاری ہے۔' ان کے مطابق، اگر چہ اس میں کسی حد تک حقیقت ہو سکتی ہے، لیکن انڈوں سے حاصل ہونے والا غذائی کولیسٹرول خون میں کولیسٹرول کو اس حد تک نہیں بڑھاتا۔ اسی وجہ سے انڈے کی زردی نہ کھانے سے متعلق پرانی ہدایات میں اب نرمی آ گئی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ دل کی بیماری میں مبتلا افراد سمیت ہر شخص اعتدال کے ساتھ روزانہ ایک سے دو انڈے کھا سکتا ہے۔ مختلف تحقیقات میں پایا گیا ہے کہ غذا میں موجود چربی کا خون میں کولیسٹرول کی سطح اور ایتھیروسکلروسس کے خطرے پر بہت کم اثر پڑتا ہے۔ ڈاکٹر ارون کمار کہتے ہیں: صرف فیملیئل ہائپرکولیسٹرولیمیا میں مبتلا افراد کے خون میں ایل ڈی ایل کولیسٹرول کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ ایک نہایت نایاب کیفیت ہے، جس میں جسم کی کولیسٹرول کو قدرتی طور پر پراسیس کرنے کی صلاحیت بہت کم ہوتی ہے۔ اس لیے ایسے افراد کے لیے طبی مشورہ لینا اور زردی سے پرہیز کرنا بہتر ہے۔ ان لوگوں کے علاوہ باقی ہر شخص بلا جھجھک زردی کھا سکتا ہے۔ اسی طرح، وہ بتاتے ہیں کہ انڈے کی زردی کھانے سے یرقان یا گردوں کی بیماری ہونے کا تصور بھی بے بنیاد ہے۔ امریکہ کے نیشنل سینٹر فار بایوٹیکنالوجی انفارمیشن (این سی بی آئی) نے بھی اس بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔

جنوری 2026 میں این سی بی آئی کی جانب سے شائع کردہ رپورٹ کے مطابق: چونکہ انڈے غذائی کولیسٹرول کا ایک بڑا ذریعہ ہیں، اس لیے طویل عرصے سے یہ سفارش کی جاتی رہی ہے کہ خون میں کولیسٹرول کی سطح بڑھنے سے بچانے کے لیے انڈوں کی کھپت کم کی جائے۔

تاہم، مختلف مطالعات میں یہ پایا گیا ہے کہ غذا میں موجود چربی کا خون میں کولیسٹرول کی سطح اور ایتھیروسکلروسس کے خطرے پر بہت کم اثر پڑتا ہے۔ ایتھیروسکلروسس ایسی حالت ہے جس میں شریانوں میں چربی جمع ہونے کے باعث وہ تنگ ہونے لگتی ہیں۔

نیشنل سینٹر فار بائیوٹیکنالوجی انفارمیشن (این سی بی آئی) کی ایک تحقیق اس کی تصدیق کرتی ہے، جس کے مطابق مرغی کے انڈے کولین، فولیٹ، وٹامن ڈی، آئیوڈین، بی وٹامنز اور اعلیٰ معیار کے پروٹین کا ذریعہ ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ صحت سے متعلق قومی ادارے اس وقت انڈوں کو زیادہ کولیسٹرول اور دل سے متعلق بیماریوں کے خطرے کا سبب نہیں سمجھتے۔

کیا دیسی مرغی کے انڈے برائلر مرغی کے انڈوں سے بہتر ہوتے ہیں؟

دراصل دونوں قسم کے انڈوں میں پروٹین اور دیگر غذائی اجزا کی مقدار تقریباً یکساں ہوتی ہے۔ چونکہ دیسی مرغیاں قدرتی خوراک کھاتی ہیں، اس لیے ان کے انڈوں میں کیروٹینائڈز کی مقدار کچھ زیادہ ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر ارون کمار کہتے ہیں کہ دیسی مرغی کے انڈے کی زردی نسبتاً موٹی اور گہرے پیلے رنگ کی ہوتی ہے، جبکہ دانہ یا فیڈ کھانے والی مرغیوں کے انڈوں کی زردی کا رنگ ہلکا ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: 'دیسی مرغیاں قدرتی طور پر گھاس اور کیڑے مکوڑے کھاتی ہیں، اس لیے ان کے انڈوں میں اومیگا 3 کی مقدار کچھ زیادہ ہو سکتی ہے۔'

اس فرق کے علاوہ دونوں قسم کے انڈوں میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے۔ دونوں میں پروٹین کی مقدار یکساں ہوتی ہے۔

وہ کہتے ہیں: 'جو لوگ پروٹین کے لیے انڈے کھاتے ہیں، وہ برائلر مرغی کے انڈے بلا جھجھک کھا سکتے ہیں۔' اُن کے بقول دیسی مرغی کے انڈوں کے لیے دو سے تین گنا زیادہ رقم خرچ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

مرغیوں کو ہارمون کے انجیکشن لگانے کے بارے میں غلط فہمی کیا ہے؟

مرغیوں کو ہارمون کے انجیکشن لگانے کا دعویٰ طویل عرصے سے کیا جاتا رہا ہے۔ اس بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک غلط فہمی ہے۔ ہارمون کے انجیکشن لگا کر مرغیاں پالنا ممکن نہیں، کیونکہ اگر ایسا کیا جائے تو اس پر بہت زیادہ لاگت آئے گی۔ مرغیوں کو صرف بیماریوں سے بچاؤ کے لیے ویکسین لگائی جاتی ہیں۔ بہت سے لوگ غلطی سے انھیں ہارمون کے انجیکشن سمجھ لیتے ہیں۔

ڈاکٹر ارون کمار کہتے ہیں کہ اس دعوے کا کوئی سائنسی ثبوت نہیں ہے کہ انڈے یا چکن کھانے کی وجہ سے لڑکیاں کم عمری میں بالغ ہو رہی ہیں۔ ان کے مطابق، بچے آج کل صحت مند خوراک اور مناسب مقدار میں پروٹین حاصل کرنے کی وجہ سے تیزی سے نشوونما پا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: 'یہ ایک سائنسی حقیقت ہے کہ گذشتہ 100 برسوں کے دوران سبزی خور افراد میں بھی بلوغت کی عمر کم ہوئی ہے۔' اس لیے اس کا دیسی یا برائلر مرغیوں کے انڈوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

کیا انڈے کھانے سے گیس کا مسئلہ بڑھتا ہے؟

ڈاکٹر ارون کمار کہتے ہیں کہ انڈے کھانے سے گیس بڑھنے جیسے کوئی مضر اثرات نہیں ہوتے۔ تاہم، بعض لوگوں کو زردی کھانے سے ہلکی سی بے آرامی محسوس ہو سکتی ہے۔ ان کے مطابق، اگر آپ باقاعدگی سے زردی کھانا شروع کر دیں تو یہ علامات آہستہ آہستہ کم ہو سکتی ہیں۔

کیا کچے انڈے کھائے جا سکتے ہیں؟

کچے انڈے کھانے سے پرہیز کرنا بہتر ہے۔ کچے انڈوں میں سالمونیلا نامی بیکٹیریا موجود ہو سکتا ہے۔ اس کی وجہ سے شدید اسہال سمیت کئی مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ کچے انڈوں میں موجود ایویڈن نامی کیمیائی مادہ جسم میں وٹامن بایوٹن کی مقدار کم کر سکتا ہے۔ اس کے نتیجے میں بعض غذائی اجزا کی کمی بھی ہو سکتی ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر ارون کمار کا کہنا ہے کہ کچے انڈے کھانے سے پرہیز کرنا ہی بہتر ہے۔ انڈہ کھانے کے طریقوں، چاہے وہ ابلا ہوا ہو، آدھا ابلا ہوا، تلا ہوا یا کسی اور طریقے سے پکایا گیا ہو، میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر ارون کمار کہتے ہیں کہ انڈوں کے بارے میں غیر ضروری الجھن میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ موٹاپے اور ذیابیطس سمیت مختلف صحت کے مسائل رکھنے والے لوگ بھی انڈوں کو اپنی خوراک کا حصہ بنا سکتے ہیں، کیونکہ یہ غذائیت سے بھرپور غذا ہے۔

☆......☆

شام کے سائے تلے

تفسیر شہاب کا جگری دوست تھا، اگر اسے اسٹیشن پر رسیو نہ کیا جاتا تو بگڑ جاتا، اس لئے نجانے کتنے عرصے کے بعد شہاب نے ریلوے اسٹیشن پر قدم رکھا تھا۔ سیاہ چادر گیٹ سے نکلی، ٹکٹ چیکر جگہ چھوڑ چکا تھا اس لئے گیٹ خالی پڑا تھا

تحریر: بسمیٰ راحت

(قسط نمبر 116)

......گذشتہ قسط کا آخری پیرا گراف)

''ٹھیک ہے باس، لیکن اختر اتنی جلدی ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہے، صرف ایک بات بتادیجئے آپ اس کے بعد آپ کی چھٹی۔''

''جی جی فرمایئے۔'' ندرت نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''گوشۂ دل میں کسی اور کا بسیرا ہے یا کتاب کے تمام اوراق سادہ ہیں، اگر کسی ورق پر کوئی نام درج کر دیا ہے تو اختر شریفانہ انداز میں گردن جھکا کر واپس لوٹ جائے گا، لیکن اگر اوراق سادہ ہیں تو یہ قلم قبول فرمایئے اور اختر کا نام لکھ لیجئے اختر نے جیب سے ایک قلم نکال کر ندرت کی جانب بڑھا دیا، اظہار محبت کا یہ بے باکانہ انداز کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی، وہ فاصلے جو نجانے کتنی خلیجوں کو عبور کرنے کے بعد طے کئے جاتے ہیں ایک ہی چھلانگ مار کر پار کر لینا اور اتنی آسانی سے مقصد کا اظہار کر دینا بڑے دل گردے کا کام تھا، ندرت پاگلوں کی طرح اسے دیکھ رہی تھی، اس کے الفاظ اور ان کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور منہ کھل گیا، اختر کا پین والا ہاتھ آگے بڑھا ہوا تھا ندرت نے بوکھلائے ہوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھا اور پریشان لہجے میں بولی۔

(آگے پڑھیئے)

''پاگل ہی ہوگئے ہیں آپ بالکل، یہ کیا بدتمیزی ہے مم میرا مطلب ہے مم معاف کیجئے گا یہ تو حماقت ہے کیا یہ حماقت نہیں ہے۔''

اختر شرارت بھری نگاہوں سے ندرت کو دیکھ رہا تھا۔

پھر اختر بولا ''نہیں حماقت نہیں بلکہ محبت ہے، ہر چند کہ دونوں ہم قافیہ لفظ ہیں لیکن دونوں کا مفہوم الگ الگ ہے، ویسے آپ اگر کتابی باتیں کرنا چاہتی ہیں تو کتابوں میں محبت کو حماقت بعض جگہ لکھا گیا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے، محبت محبت ہے اور حماقت حماقت ہے منطق کی رو سے''

''اختر صاحب آپ آپ شاید مجھ سے بدتمیزی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''ارے نہیں بھائی، محبت کا لفظ سمجھانے میں آپ کو بڑی دقت پیش آرہی ہے نجانے کیا کیا مفہوم دیتی جارہی ہیں آپ اسے، سیدھے سادے الفاظ میں ایک بات نہیں بتاسکتیں آپ، کسی اور کو چاہتی ہیں یا نہیں۔''

دفعتہً ہی ندرت نے اپنے آپ کو سنبھالا یہ اختر تو جوتوں سمیت آنکھوں میں گھسنے کی کوشش کر رہا ہے نجانے کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو، اتنی آسانی سے کسی کو اپنے لئے تختۂ مشق بنالینا واہ یہ کیسے ممکن ہے۔ چنانچہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آہ آپ نے میرا اور جمن کے درمیان جو خلیج پیدا کر دی ہے اختر صاحب میں اس پر انتہائی افسردہ ہوں۔'' ندرت نے منہ بناتے ہوئے کہا

''نہاں خانہ دل میں محبت کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے اور اس دنیا میں ضرورت زندگی کی تمام ہی چیزیں درکار ہیں اگر اس کائنات میں آپ کو ایک باورچی کی ضرورت ہے تو اس باورچی کو دوبارہ لایا جاسکتا ہے لیکن اختر اپنے مقام کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔''

''پھر وہی فضول باتیں۔''

''دیکھو بھئی ایک بات کان کھول کر سن لو، ہم ذرا مختلف قسم کے آدمی ہیں، کسی بھی مسئلے میں شرارت اور دلچسپیاں اپنی جگہ ایک حیثیت رکھتی ہی لیکن اگر کوئی سنجیدہ معاملہ درپیش ہو تو پھر ذرا گفتگو میں تبدیلی آجانی چاہیئے ہمیں آپ کی شرارتیں بڑی بھائی ہیں ندرت، آپ کی شخصیت آپ کی حیثیت، آپ کی کیفیت یہ سب کچھ اچھی طرح پرکھی ہیں، اور اس کے بعد اپنے ذہن میں آپ کے لئے جگہ تلاش کی ہے، پتہ یہ چلا کہ آپ نے ہمارے وجود کے تین چوتھائی سے زیادہ حصے پر قبضہ جما رکھا ہے اب ندرت صاحب ایک شخص اگر اس قدر پھنس چکا ہو تو اس کے نکلنے کا کوئی طریقہ بتادیں ورنہ پھر یہ پین قبول کریں۔''

نجانے کیوں ندرت کا دل بڑی زور سے دھڑکا تھا، ندرت سراسیمگی سے اختر کو دیکھ رہی تھی، دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوئی جارہی تھیں آج دل کچھ عجیب انداز میں دھڑکا تھا، اختر کے الفاظ نجانے کیوں اجنبی اجنبی سے محسوس ہوئے تھے، یوں لگتا تھا جیسے زندگی میں اس سے پہلے کبھی یہ لہجہ یہ زبان نہ سنی ہو، کچھ دیر تک وہ اسی کیفیت کا شکار رہی اور پھر دفعتہً اس کی فطرت جاگ اٹھی، اس نے اختر کے بڑھائے ہوئے قلم کو دیکھ کر کہا۔

''خوبصورت ہے، اگر اس کی نمائش مقصود تھی تو اس کے اور طریقے ہوسکتے تھے، آپ کی زبان سے اختر صاحب یہ الفاظ معاف کیجئے گا کچھ احمقانہ سے لگے۔''

اختر کے ہونٹوں پر وہی دلآویز مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی، کمبخت نے کسی طور مرعوب ہونا نہیں سیکھا تھا، رات کی تنہائیوں میں ندرت نے جب اختر کے بارے میں سوچا تھا تو یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ صرف مذاق کرسکتا ہے، کسی ایسے مسئلے میں سنجیدگی کیا معنی رکھتی ہے، اور پھر حرفوں کا بنا ہوا ہے، شرارتوں میں اتنا ہی شدت پسند جتنی وہ خود تھی، اگر اس نے یہ شرارت سنجیدگی سے کی ہے تو اس کا جواب بھی اسے اسی انداز میں ملنا چاہیئے، لیکن نجانے ذہن کیوں بھٹک رہا تھا جو کچھ کہنا چاہتی تھی وہ کہہ نہیں پارہی تھی، یا پھر ذہن میں اس کی ترتیب نہیں تھی۔

''ہاں ہوسکتا ہے کہ میرے یہ الفاظ آپ کو احمقانہ لگے ہوں لیکن دنیا میں اظہار کے جو طریقے رائج ہیں میں نے ان ہی کے مطابق ااپ سے واردات دل کہی ہے ندرت سچ کہہ رہا وہس اس سے زیادہ نہ کہلواؤ، تمہیں اختیار ہے کہ مجھے دھتکار دو کسی ایسے لہجے میں مخاطب کرو جس سے مجھے اپنی توہین کا احساس ہو۔ براہ کرم یہ کام میری درخواست پر ضرور کر ڈالو، یوں نہ سمجھو کہ اس کے بعد میرے اور تمہارے درمیان رابطے ختم ہوجائیں گے ہاں کم ازکم جب تمہارا لہجہ یاد آئے گا تو دل میں پیدا ہونے والی کسک کچھ مدھم پڑ جائے گی، اتنا تو حق رکھتا ہوں نا۔'' اختر نے ندرت کو بغور دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''اگر آپ کوئی سنجیدہ مذاق کر رہے ہیں اختر صاحب تو میں آپ سے درخواست کروں گی کہ کم ازکم ایسا مذاق مجھ سے نہ کیجئے، یہ ساری باتیں فضول باتیں ہیں، جمن کی شخصیت کچھ اور تھی اس سے کچھ کہتے ہوئے جھجک نہیں ہوتی تھی کیونکہ اگر سنجیدگی سے دیکھا جائے تو میری اور اس کی حیثیت یکساں تھی، کچھ لوگ مالکوں کے منہ چڑھے ہوتے ہیں لیکن وہ مالک تو نہیں بن جاتے رہتے تو وہی ہیں جو ان کی حیثیت ہوتی ہے، میرے والد غلام احمد صاحب اس کوٹھی میں ملازم کی حیثیت رکھتے ہیں اور میں تین نمبر کی باسی ہوں کیا سمجھے آپ؟'

''سمجھ رہا ہوں اس کے علاوہ بھی کچھ سمجھایئے۔'' اختر نے کہا۔

''آپ یہ دلچسپ مذاق کر کے اپنی توہین کر رہے ہیں اختر صاحب، میرا کیا جاتا ہے آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ بڑے لوگ ازراہِ مذاق کسی معمولی سی لڑکی سے ایسے الفاظ کہہ دیتے ہیں کہ وہ بیچاری اپنی اوقات بھول جاتی ہے، لیکن اس کے جواب میں آپ سے ایک عرض کر دوں کہ ہم حالات کے مارے ہوئے ہیں، اس سطح کے لوگ نہیں ہیں جس سطح پر آپ ہمیں دیکھ رہے ہیں میرے والد مشرقی پاکستان میں تھے، بہت اچھا کاروبار تھا ہمارا دولت مند لوگ تھے، ایسی بات نہیں ہے کہ میرے والد نے صرف ڈرائیوری کی ہو، اپنی گاڑی چلاتے ہوئے انہوں نے گاڑی چلانا سیکھی تھی، حالات کے مارے ہوئے ضرور ہیں لیکن وہ نہیں ہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں، براہ کرم آپ اپنا وہی رویہ برقرار رکھئے، اس عمارت کے رہنے والے اچھے ہیں، ثناء نے مجھے اپنی سہیلی کی حیثیت دی ہے، آپ کیوں میرا مذاق اڑانے پر تلے ہوئے ہیں۔'' ندرت ذہنی طور پر بھٹک رہی تھی، اسے پورا پورا احساس تھا کہ وہ کہنا کچھ اور چاہتی ہے لیکن دل کی گہرائیوں سے نکلنے والے الفاظ کوئی اور ہی حیثیت رکھتے ہیں، اس کے لہجے میں ایک شکایت سی پیدا ہوگئی تھی، ایک اضطراب اور بے چینی سی مترشح تھی اس کی آواز میں، جیسے چاہتی ہو کہ اسے دلا سے دیئے جائیں اس سے کہا جائے کہ حقیقت وہ نہیں ہے جو وہ سمجھ رہی ہے، ساری شوخی ساری طراری ہوا ہوگئی تھی۔ نجانے یہ کونسا لہجہ تھا نجانے یہ کیسے بول تھے کہ اس نے اس سے اس کی شخصیت چھین لی تھی، اس کے اندر ایک عجیب سی بے کلی پیدا ہوگئی تھی اور اختر کی پرسکون مسکراہٹ اس کی فطرت کو تہہ و بالا کر رہی تھی، جب ردا سب کچھ کہہ چکی تو اختر نے کہا۔

''اس تعارف کا مزید شکریہ یہ قلم قبول کر لیجے نا۔'' اختر نے پھر قلم اس کی جانب بڑھایا

''اختر صاحب آپ نے جو کچھ زبان سے کہا اس کی پاسداری نہ کی، آپ نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا لیکن شاید آپ کسی کو دوست نہیں بنا سکتے، شاید آپ نے مجھ پر غور کر لیا ہے۔'' وہ ایک جھٹکے سے مڑی اور سامنے ہی ثناء نظر آگئی،

اس وقت ندرت کی کیفیت بہت عجیب ہوگئی تھی، نجانے کیوں دل اندر سے ڈوبا ڈوبا سا محسوس ہو رہا تھا، ثناء ہی کو تلاش کرتی پھر رہی تھی، لیکن اس وقت ثناء کا نظر آجانا اس کے لئے وبالِ جان بن گیا تھا، کسی تنہا گوشے میں جانا چاہتی تھی، اپنے آپ کو پرسکون کرنا چاہتی تھی، لیکن ثناء نے اسے دیکھ لیا تھا، اب بھلا اس بات کی کیا گنجائش تھی کہ وہ ثناء سے نگاہیں چرا کر کہیں نکل جائے، بلکہ اپنے آپ کو سنبھالنا ضروری تھا کہیں اس کی یہ کیفیت ثناء کی نگاہوں میں نہ آجائے، ثناء تو اسے تنگ کر ڈالے گی، جمن کی بات دوسری تھی، وہ ایک کھلا کھلا مذاق تھا لیکن اختر اور جمن میں بہت بڑا فرق تھا، اختر کے الفاظ کا ردعمل براہ راست اس کی اپنی ذات پر ہوا تھا، جبکہ جمن تفریح کا ایک عام ذریعہ تھا۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہی اور ثناء بھی اس کے قریب پہنچ گئی۔

''ہیلو اللہ رکھی۔''

''ہیلو مالک کی بیٹی؟'' اس نے اپنی آواز کو حتی الامکان قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔

''اختر سے کیا باتیں ہو رہی تھیں؟''

''کوئی خاص بات نہیں ثناء، بس تمہارے مہمان ہیں، اس لئے معاف کر دیتی ہوں، ورنہ مزہ چکھادوں حضرت کو۔''

''یہ شخص مجھے بھی ضرورت سے آگے ہی معلوم ہوتا ہے مگر کیا کروں خالد کا بھائی ہے، ورنہ ورنہ...'' ثناء ایک دم چپ ہوگئی۔

ندرت کی آنکھوں میں ایک دم شرارت ابھر آئی۔

''مطلب''

''مطلب یہ کہ.. یہ کہ.. بس کیا کروں اس کے ساتھ عجیب سی حرکتیں کرتا ہے سوچتی ہوں چند روز کے مہمان ہیں یہ، کیا یاد کریں گے کہ کسی نے معاف کر دیا ورنہ ناکوں چنے چبوادوں حضرت کو''

''مگر آپ نے ایک خاص بات کہی ہے ملکہ عالیہ۔'' ندرت ثناء کو کسی طور یہ احساس نہیں ہونے دینا چاہتی تھی کہ اس کی اپنی ذات بھی اس وقت کچھ گڑ بڑ ہے۔''

''کیا خاص بات کہی ہے میں نے؟'' ثناء نے بھنویں سکوڑتے ہوئے کہا۔

''آپ نے فرمایا ہے کہ یہ خالد کا بھائی ہے اس لئے معاف کئے دیتی ہوں ورنہ، اس کا مطلب ہے کہ دیور صاحب کے ساتھ رعایت کی جارہی ہے۔'' ندرت شرارت سے بولی۔

''لاحول ولاقوۃ، کیا عجیب لفظ استعمال کیا ہے تم نے ارے مجھے اس لفظ کا مطلب تو سمجھادو، دیور ..دے...ور...کیا مطلب ہوا اس بات کا.....احمق آدمی دیکھو.. کیسے گھورے جارہا ہے ہمیں.. ندرت کم ازکم اس کے جانے سے پہلے اسے کوئی ایسا سبق تو دے دو کہ یہ بھی واپس جانے کے بعد ہمیں یاد کرتا رہے۔''

''ہوں..'' ندرت نے پرخیال انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ''اجازت ہے مالک کی بیٹی

''سو فیصدی اجازت ہے، بس اسے کوئی نقصان نہ پہنچے، لیکن ایسا کرو کہ یاد رکھے زندگی بھر''

''ٹھیک ہے اگر آپ کی ہدایت ہے تو ہوجائے گا یہ کام بھی۔'' ندرت نے کہا اور ثناء مسکرانے لگی پھر بولی۔

''آؤ کہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے اس شخص کو اس وقت اپنے اوپر مسلط نہیں کرنا ہے۔''

''تو پھر اپنے کمرے ہی میں چلو'' ندرت نے نجانے کس خوف کے تحت کہا، اختر کی نگاہیں اسے اپنے وجود مین چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ثناء نے انکار نہیں کیا اور دونوں کوٹھی کے اندرونی حصے کی جانب چل پڑیں۔

خالد نے اختر کو اپنے کمرے میں بلایا جب اختر اندر پہنچا تو خالد نے ہاتھ میں پکڑا ہوا پرچہ اختر کے ہاتھ میں تھمادیا اور اختر نے دلچسپی سے اسے کھولا۔ (جاری ہے)

کیا عالمی موسم ایک نئی کروٹ لینے والا ہے؟

بحرالکاہل کی تہوں میں جمع غیر معمولی حرارت اور بدلتے عالمی موسمیاتی امکانات

ڈاکٹر محمد طیب خان سنگھانوی

دنیا کے نقشے پر بحرالکاہل ایک وسیع نیلے سمندر کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا، مگر اسی سمندر کی سطح کے نیچے چھپی ہوئی حرارت کبھی پوری دنیا کے موسموں کا مزاج بدل دیتی ہے۔ بظاہر ایک خطے میں رونما ہونے والی سمندری تبدیلی ہزاروں کلومیٹر دور واقع براعظموں میں بارش، خشک سالی، درجہ حرارت، برف باری، طوفانی سرگرمی اور زرعی حالات پر اثر انداز ہوسکتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ''ایل نینو'' محض ایک موسمی اصطلاح نہیں رہتا بلکہ کرہ ارض کے باہم مربوط آب وہوا کے نظام کی ایک اہم علامت بن جاتا ہے۔

2026 کا سال اس اعتبار سے غیر معمولی اہمیت اختیار کر چکا ہے کہ بحرالکاہل کے استوائی مشرقی اور وسطی حصے میں سمندر کی سطح کے درجہ حرارت میں غیر معمولی اضافہ مسلسل مضبوط ہو رہا ہے۔ امریکی قومی سمندری و فضائی انتظامیہ، یعنی این او اے اے، کے 10 ستمبر 2026 کے تشخیصی جائزے کے مطابق مشرقی استوائی بحرالکاہل میں سطحی سمندری درجہ حرارت کا معمول سے انحراف بعض علاقوں میں +3.0°C سے بھی تجاوز کر چکا تھا۔ اگست 2026 میں نینو-3.4 خطے کا ماہانہ انحراف +1.8°C، نینو-3 کا +2.5°C اور نینو-1+2 کا +3.4°C ریکارڈ کیا گیا، جب کہ نینو-4 کی قدر +0.1°C رہی۔

یہ اعداد محض چند اعشاریے نہیں، ان کے پیچھے ایک پیچیدہ سمندری و فضائی نظام حرکت میں ہے۔ بحرالکاہل کی سطح کے نیچے بھی غیر معمولی حرارت جمع ہے اور بعض گہرائیوں پر زیرِ سطح پانی کے درجہ حرارت کا معمول سے انحراف +10.0°C سے زیادہ دیکھا گیا ہے۔ یہاں ایک اہم سائنسی وضاحت ضروری ہے: +10.0°C پانی کا مطلق درجہ حرارت نہیں بلکہ معمول کے مقابلے میں درجہ حرارت کا غیر معمولی انحراف ہے۔ یہی زیرِ سطح حرارت آنے والے مہینوں میں سطحی سمندر کے رویے کو متاثر کر سکتی ہے۔

این او اے اے کے مطابق سمندر اور فضا دونوں میں ایسی تبدیلیاں دکھائی دے رہی ہیں جو مضبوط ہوتے ہوئے ایل نینو سے مطابقت رکھتی ہیں۔ استوائی بحرالکاہل کے بعض حصوں میں ہواؤں کی تبدیلیاں، وسطی و مشرقی بحرالکاہل میں بادلوں اور بارش کی سرگرمی میں اضافہ اور انڈونیشیا کے اوپر بادلوں کی سرگرمی میں کمی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ معاملہ صرف گرم سمندری پانی تک محدود نہیں بلکہ سمندر اور فضا ایک دوسرے کے ساتھ مربوط انداز میں ردعمل دے رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ 2026-27 کا موجودہ ایل نینو معمول کے ایک موسمی مرحلے سے بڑھ کر عالمی سائنسی توجہ کا مرکز بن چکا ہے۔ این او اے اے نے 10 ستمبر کو کہا کہ شمالی نصف کرہ ارض کے خزاں اور موسمِ سرما 2026-27 کے دوران ''بہت مضبوط'' ایل نینو کے امکانات 90 فیصد سے زیادہ ہیں۔ مزید اہم بات یہ ہے کہ اکتوبر تا دسمبر 2026 کے تین ماہ کے دوران نسبتاً سمندری نینو اشاریے، یعنی آر او این آئی، کی قدر +2.5°C یا اس سے زیادہ ہونے کے ایک تاریخی طور پر غیر معمولی واقعے کا امکان 75 فیصد بتایا گیا ہے۔

یہاں ''تاریخی واقعے'' کی اصطلاح کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی ریکارڈ پہلے ہی ٹوٹ چکا ہے۔ 75 فیصد ایک پیش گوئی کا امکان ہے۔ این او اے اے کی تعریف کے مطابق اگر اکتوبر، نومبر اور دسمبر 2026 کے تین ماہ کا آر او این آئی +2.5°C یا اس سے زیادہ رہا تو یہ 1950 کے بعد ریکارڈ کیے گئے سابقہ ایل نینو واقعات کے مقابلے میں انتہائی مضبوط واقعہ شمار ہوگا۔ لہٰذا صحافتی زبان میں اسے ''تاریخی سطح تک پہنچنے کا 75 فیصد امکان'' کہنا زیادہ درست ہے، نہ کہ یہ کہنا کہ تاریخ کا سب سے طاقتور ایل نینو بالفعل رونما ہو چکا ہے۔

17 ستمبر 2026 کو جاری ہونے والے این او اے اے کے تازہ موسمی جائزے نے اس تصویر کو مزید واضح کیا۔ اس کے مطابق ایل نینو موجود ہے اور مسلسل مضبوط ہو رہا ہے، جب کہ بہت مضبوط واقعے کے امکانات اب بھی 90 فی صد سے زیادہ ہیں۔ تازہ ترین ہفتہ وار نینو-3.4 اشاریہ +2.0°C تک پہنچ چکا تھا۔ اس طرح اگست کی ماہانہ قدر +1.8°C اور ستمبر کے وسط کی تازہ ہفتہ وار قدر +2.0°C کو الگ الگ سمجھنا ضروری ہے۔ دونوں اعداد میں کوئی تضاد نہیں؛ پہلا پورے اگست کی ماہانہ اوسط ہے، جب کہ دوسرا تازہ ترین ہفتہ وار صورتِ حال کی نمائندگی کرتا ہے۔

یہی وہ مرحلہ ہے جہاں ''سپر ایل نینو'' کی اصطلاح عوامی اور صحافتی گفتگو میں سامنے آتی ہے۔ تاہم سائنسی دیانت کا تقاضا ہے کہ اسے باقاعدہ الگ سائنسی زمرہ نہ سمجھا جائے۔ این او اے اے کی سرکاری درجہ بندی میں بنیادی اصطلاح ''ایل نینو'' اور اس کی شدت کے درجات ہیں؛ ''سپر ایل نینو'' ایک غیر رسمی تعبیر ہے جو غیر معمولی طور پر طاقتور ایل نینو کے لیے ذرائع ابلاغ اور بعض ماہرین استعمال کرتے ہیں۔ موجودہ 2026-27 واقعے کی شدت کے پیش نظر یہ اصطلاح زیرِ بحث ضرور ہے، لیکن اسے این او اے اے کی کوئی باقاعدہ الگ درجہ بندی قرار دینا درست نہیں ہوگا۔

اس صورتِ حال کی اہمیت صرف بحرالکاہل تک محدود نہیں۔ ایل نینو ایک عالمی سطح پر مربوط موسمیاتی نظام کو متاثر کرسکتا ہے۔ اس کے اثرات کہیں زیادہ بارش، کہیں خشک سالی، کہیں غیر معمولی گرمی اور کہیں سمندری و فضائی طوفانی سرگرمی کی صورت میں سامنے آسکتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک اور احتیاط ضروری ہے: کسی مضبوط ایل نینو کا مطلب یہ نہیں کہ دنیا کے ہر خطے میں لازماً ایک ہی قسم کا موسم پیدا ہوگا۔ اثرات کا انحصار جغرافیہ، موسم کے مرحلے، دیگر سمندری و فضائی عوامل اور مقامی موسمیاتی حالات پر ہوتا ہے۔ خود این او اے اے بھی واضح کرتا ہے کہ ایل نینو کی شدت اور کسی مخصوص علاقے پر اس کے اثرات کی شدت ایک ہی چیز نہیں اور مضبوط واقعہ بھی کسی مخصوص اثر کی ضمانت نہیں دیتا۔

یوں 2026-27 کا اصل سوال صرف یہ نہیں کہ ''ایل نینو کتنا مضبوط ہوگا؟'' بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کی سمندری حرارت، فضائی گردش اور دیگر موسمیاتی عوامل کے ساتھ باہمی تعامل کس طرح دنیا کے مختلف خطوں میں موسم کا نقشہ تشکیل دے گا۔ یہی وہ سوال ہے جس کے جواب کے لیے سائنس دان محض سطح سمندر کو نہیں بلکہ سمندر کی گہرائی، ہواؤں، بادلوں، دباؤ، بارش اور عالمی سمندری گردش کے متعدد اشاریوں کو ایک ساتھ دیکھ رہے ہیں۔

بحرالکاہل کے اس بدلتے ہوئے منظرنامے کو سمجھنے کے لیے صرف موجودہ اعداد کافی نہیں؛ اصل سوال یہ ہے کہ یہ حرارت آئندہ مہینوں میں کہاں جائے گی، فضا کے بڑے پیمانے پر گردش کرنے والے نظاموں کو کس طرح متاثر کرے گی اور مختلف خطوں میں اس کے اثرات کس شکل میں ظاہر ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی موسمیاتی مراکز مسلسل نئے مشاہدات کو اپنے پیش گوئی کے ماڈلز میں شامل کر رہے ہیں۔

8 ستمبر 2026 کو امریکی قومی سمندری و فضائی انتظامیہ کی جیوفزیکل فلوئڈ ڈائنامکس لیبارٹری نے ستمبر کی پیش گوئی جاری کرتے ہوئے بتایا کہ اس کے تجرباتی ماڈل میں ایل نینو کی متوقع بلند ترین شدت گزشتہ ماہ کے اندازے کے مقابلے میں قدرے کم دکھائی دی، تاہم موسمِ خزاں کے ا?خری حصے اور موسمِ سرما کے ا?غاز میں تاریخی طور پر مضبوط ایل نینو کے بارے میں اعتماد بدستور بلند رہا۔ اس ماڈل کے تمام 30 پیش گوئی ارکان نے موجودہ واقعے کو تاریخی مضبوط واقعات کے مقابلے میں انتہائی طاقتور سطح تک پہنچنے یا ان کے برابر آنے کی سمت میں دکھایا۔

یہاں ''تمام 30 ارکان'' کی اہمیت یہ ہے کہ موسمیاتی پیش گوئی ایک واحد لکیر یا ایک قطعی مستقبل نہیں ہوتی۔ مختلف ابتدائی حالات کے ساتھ ماڈل کو بار بار چلایا جاتا ہے تاکہ ممکنہ مستقبل کے مختلف راستے سامنے آسکیں۔ ان راستوں کے پھیلاؤ سے سائنس دان اندازہ لگاتے ہیں کہ پیش گوئی میں کتنا اعتماد ہے اور غیر یقینی پن کہاں بڑھ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 2026-27 کے ایل نینو کے بارے میں موجودہ اعتماد نسبتاً بلند ہونے کے باوجود آئندہ موسموں کے ہر مقامی اثر کو قطعی طور پر بیان کرنا ممکن نہیں۔

این او اے اے کے 17 ستمبر کے موسمی جائزے میں بھی یہی احتیاط نمایاں ہے۔ اس نے واضح کیا کہ مضبوط ایل نینو کے باعث ایل نینو سے مطابقت رکھنے والے موسمی اثرات کے امکانات بڑھتے ہیں، مگر ان کی ضمانت نہیں ہوتی۔ اسی لیے شمالی امریکا کے مختلف علاقوں کے لیے درجہ حرارت اور بارش کے امکانات الگ الگ بیان کیے گئے ہیں۔ بعض شمالی اور مغربی علاقوں میں معمول سے زیادہ درجہ حرارت کے امکانات بڑھتے ہیں، جبکہ جنوبی علاقوں اور کیلیفورنیا سمیت بعض خطوں میں معمول سے زیادہ بارش کے امکانات نمایاں ہوسکتے ہیں۔

اس سے ایک بنیادی سائنسی حقیقت سامنے آتی ہے: ایک ہی ایل نینو پوری دنیا پر یکساں موسم مسلط نہیں کرتا۔ عالمی موسمیاتی نظام میں مقامی جغرافیہ، سمندری درجہ حرارت کے دیگر نمونے، فضائی دباؤ، ہواؤں کی گردش اور طویل مدتی سمندری تغیرات بھی اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ چناں چہ کسی ایک خطے میں ایل نینو کا اثر غیر معمولی بارش ہوسکتا ہے تو دوسرے خطے میں خشک سالی یا گرمی میں اضافہ بھی ممکن ہے۔

پاکستان کے لیے یہ سوال اس لیے بھی اہم ہے کہ ملک کا زرعی، آبی اور معاشی نظام موسمی بارشوں سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ بالخصوص دریائے سندھ کے بالائی حوض میں بارش اور برف پگھلنے کے نظام میں ہونے والی تبدیلیاں پانی کی دستیابی پر اثر ڈال سکتی ہیں۔ تاہم کسی مخصوص سال میں پاکستان کی بارش، سیلاب یا خشک سالی کو صرف ایل نینو سے براہِ راست منسوب کرنا سائنسی طور پر محتاط طرزِ عمل نہیں ہوگا۔ ایل نینو ایک اہم عالمی عامل ہوسکتا ہے، مگر مقامی اور علاقائی موسمیاتی عوامل بھی نتیجے کو بدل سکتے ہیں۔

اسی طرح کراچی جیسے ساحلی شہر کے بارے میں بھی یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ موجودہ ایل نینو لازماً کسی ایک مخصوص درجہ حرارت، بارش یا شہری موسمی واقعے کا سبب بنے گا۔ کراچی کا موسم بحیرہ عرب، مقامی ہواؤں، سمندری سطح کے درجہ حرارت، مغربی ہواؤں کے نظام اور علاقائی فضائی گردش سمیت متعدد عوامل سے تشکیل پاتا ہے۔ ایل نینو اس بڑے نظام کے ایک حصے کو متاثر کرسکتا ہے، لیکن کسی مخصوص مقامی نتیجے کی پیش گوئی کے لیے علاقائی موسمیاتی ماڈلز اور تازہ مشاہدات ضروری ہیں۔

یہی احتیاط دنیا کے دوسرے خطوں کے لیے بھی ضروری ہے۔ ماضی کے بڑے ایل نینو واقعات، مثلاً 1982-83، 1997-98 اور 2015-16، نے دنیا کے مختلف حصوں میں نمایاں موسمیاتی اثرات پیدا کیے، لیکن ہر واقعہ اپنی مخصوص سمندری و فضائی کیفیت کے باعث دوسرے سے مختلف بھی رہا۔ موجود 2026-27 واقعے کو ماضی کے واقعات سے تشبیہ دینا مفید ہے، مگر اسے ان کا عین تکرار سمجھنا درست نہیں۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ ستمبر 2026 کی سائنسی پیش گوئی میں خود ماڈلز کے اندر معمولی تبدیلیاں بھی سامنے آئی ہیں۔ جیو فزیکل فلوئڈ ڈائنامکس لیبارٹری کے مطابق ستمبر کے ماڈل میں ایل نینو کی بلند ترین متوقع شدت گزشتہ ماہ کے مقابلے میں قدرے کم ہوئی، لیکن اس کے باوجود تاریخی طور پر مضبوط واقعے کے امکانات برقرار رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ''ریکارڈ ٹوٹنا'' ابھی ایک یقینی مشاہدہ نہیں بلکہ ایک مضبوط پیش گوئی کا امکان ہے۔

یہاں انسانی علم کی ایک خوب صورت حد بھی سامنے آتی ہے۔ سائنس مستقبل کو ایک قطعی لکیر کے طور پر نہیں دیکھتی

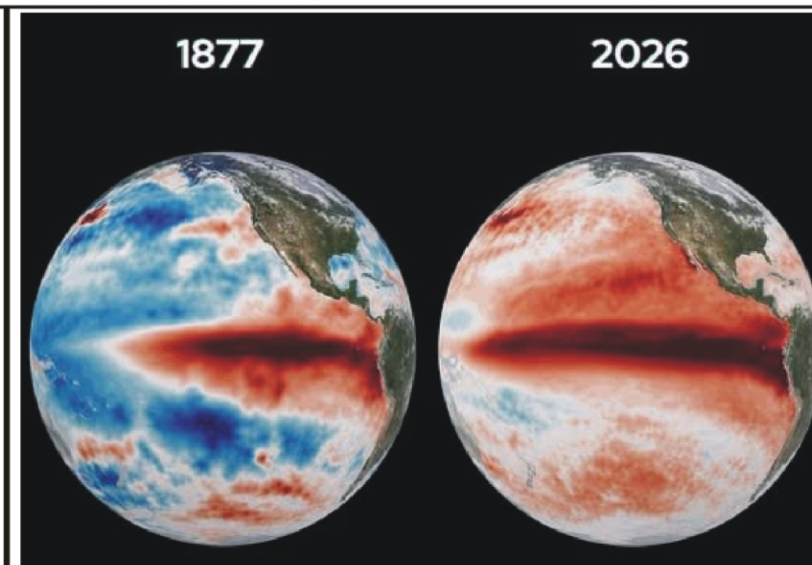

بلکہ امکانات کے دائرے میں دیکھتی ہے۔ آج ہمارے پاس مصنوعی سیاروں، سمندری پیمائش کے آلات، خودکار مشاہداتی نظام، کمپیوٹر ماڈلز اور عالمی ڈیٹا نیٹ ورکس کی ایسی قوت موجود ہے جو چند دہائیاں پہلے تصور بھی نہیں کی جاسکتی تھی، مگر اس کے باوجود فطرت کا ہر راز مکمل طور پر ہمارے سامنے نہیں آتا۔

بحرالکاہل کی موجودہ صورتِ حال اسی حقیقت کی یاد دہانی ہے۔ سمندر کی سطح بظاہر خاموش ہوسکتی ہے، مگر اس کی تہوں میں موجود غیر معمولی حرارت، فضا میں بدلتی ہوئی ہوائیں اور بادلوں کی حرکت ایک ایسے موسمیاتی عمل کی تشکیل کررہی ہے جس کے اثرات آنے والے مہینوں میں دنیا کے مختلف حصوں میں محسوس ہوسکتے ہیں۔ اگست میں نینو-3.4 کی ماہانہ قدر +1.8°C تھی، ستمبر کے وسط میں تازہ ہفتہ وار قدر +2.0°C تک پہنچ گئی، مشرقی استوائی بحرالکاہل کے بعض حصوں میں سطحی انحراف +3.0°C سے تجاوز کرچکا ہے اور زیرِ سطح بعض مقامات پر معمول سے +10.0°C سے زیادہ انحراف موجود ہے۔

اب اگلا فیصلہ کن مرحلہ 2026 کے آخری مہینوں اور 2027 کے ابتدائی حصے میں سامنے آئے گا۔ این او اے اے کے مطابق اکتوبر تا دسمبر 2026 میں +2.5°C یا اس سے زیادہ آر او این آئی کی ''تاریخی'' سطح تک پہنچنے کا امکان 75 فی صد ہے، جب کہ شمالی نصف کرہ ارض کی خزاں اور موسمِ سرما کے دوران بہت مضبوط ایل نینو کے امکانات 90 فی صد سے زیادہ ہیں۔

اگر یہ پیش گوئی عملی مشاہدات میں بھی برقرار رہتی ہے تو 2026-27 کا ایل نینو جدید موسمیاتی ریکارڈ کے اہم ترین واقعات میں شمار ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کا اصل تاریخی مقام اس وقت طے ہوگا جب پورا واقعہ مکمل ہوجائے گا اور سائنس دان اس کے مشاہدہ شدہ اعداد و شمار کو سابقہ واقعات کے ساتھ حتمی طور پر موازنہ کرسکیں گے۔

اس مرحلے پر ایک اور اہم پہلو قابلِ غور ہے: ایل نینو صرف موسم کا مسئلہ نہیں، بلکہ پانی، خوراک، توانائی اور معیشت کا بھی مسئلہ بن سکتا ہے۔ اگر کسی خطے میں بارش کے معمول میں نمایاں تبدیلی آتی ہے تو اس کا اثر فصلوں کی پیداوار پر پڑسکتا ہے؛ اگر کہیں خشک سالی بڑھتی ہے تو آب پاشی اور پینے کے پانی کے ذخائر دباؤ میں آسکتے ہیں؛ اور اگر کسی دوسرے خطے میں غیر معمولی بارش ہوتی ہے تو سیلابی خطرات، بنیادی ڈھانچے اور شہری نظام متاثر ہوسکتے ہیں۔ عالمی موسمیاتی ادارہ بھی واضح کرتا ہے کہ بہت مضبوط ایل نینو بارش اور درجہ حرارت کے نمونوں میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کرسکتا ہے اور سیلاب، خشک سالی اور شدید گرمی کے خطرات بڑھا سکتا ہے۔

اسی لیے عالمی موسمیاتی ادارے نے ستمبر 2026 میں اس بات پر زور دیا کہ ایل نینو فروری 2027 تک برقرار رہنے کے تقریباً 100 فیصد امکان کے ساتھ سال کے اختتام تک بہت مضبوط شدت اختیار کرسکتا ہے۔ اس عالمی ادارے کے مطابق اس صورتِ حال کا مطلب یہ نہیں کہ ہر خطے میں ایک جیسا موسم پیدا ہوگا، بلکہ یہ کہ مختلف علاقوں میں موسمیاتی نمونوں کے غیر معمولی ہونے کے امکانات بڑھ جائیں گے۔ یوں عالمی سطح پر اصل ضرورت پیشگی تیاری، مسلسل نگرانی اور مقامی سطح پر موسمیاتی معلومات کو فیصلہ سازی میں شامل کرنے کی ہے۔

بین الاقوامی تحقیقی ادارے آئی آر آئی کے اگست 2026 کے جائزے نے بھی اس تشویش کو مزید سائنسی بنیاد فراہم کی تھی۔ اس کے مطابق وسط اگست تک 26 میں سے 25 ماڈلز نے اکتوبر تا دسمبر 2026 کے دوران نینو-3.4 میں +2.0°C یا اس سے زیادہ انحراف کی پیش گوئی کی، جبکہ 15 ماڈلز نے +3.0°C یا اس سے زیادہ کی سطح تک پہنچنے کا امکان ظاہر کیا۔ آئی آر آئی نے یہ بھی بتایا کہ 2026 کا ایل نینو ابتدائی 2027 تک برقرار رہنے کی مضبوط علامات رکھتا ہے۔ Science

یہاں ایک اور اہم سائنسی اشارہ جنوبی ارتعاشی اشاریہ ہے۔ ایل نینو صرف سمندر کے گرم ہونے کا نام نہیں؛ اس کے ساتھ فضا میں دباؤ کے فرق اور ہواؤں کی گردش بھی بدلتی ہے۔ آئی آر آئی کے اگست کے تجزیے میں جولائی 2026 کا جنوبی ارتعاشی اشاریہ -29.1 اور 17 اگست تک 30 روزہ اشاریہ -18.6 رپورٹ ہوا، جب کہ استوائی جنوبی ارتعاشی اشاریے میں بھی منفی قدر دیکھی گئی۔ یہ اعداد اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ بحرالکاہل کی سمندری حرارت کے ساتھ فضائی گردش بھی ایل نینو کے موافق سمت میں تبدیل ہورہی تھی۔

اس تعلق کو سمجھنا ضروری ہے، کیوں کہ ایل نینو دراصل سمندر اور فضا کے درمیان ایک باہمی تعامل ہے۔ اگر سمندر گرم ہو اور فضا اس تبدیلی کا جواب نہ دے تو معاملہ روایتی ایل نینو کی مکمل شکل اختیار نہیں کرتا۔ لیکن جب گرم سمندری سطح کے ساتھ تجارتی ہواؤں میں تبدیلی، فضائی دباؤ کے نمونوں میں فرق، بادلوں اور بارش کی سرگرمی میں تبدیلی اور واکر گردش کی کمزوری بھی شامل ہوجائے تو سمندر اور فضا ایک دوسرے کو تقویت دینے لگتے ہیں۔ یہی باہمی تقویت ایل نینو کے بڑھنے کی بنیادی حرکیات میں شمار ہوتی ہے۔

اس کے عالمی درجہ حرارت سے تعلق کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ عالمی موسمیاتی ادارہ واضح کرتا ہے کہ ایل نینو عموماً عالمی اوسط درجہ حرارت پر عارضی اضافی اثر ڈالتا ہے، کیونکہ بحرالکاہل کی گرم سطح سمندر اور فضا کے درمیان توانائی اور نمی کے تبادلے کو بدل دیتی ہے۔ تاہم یہ طویل مدتی انسانی ساختہ عالمی حدت کا متبادل یا واحد سبب نہیں۔ دونوں مظاہر ایک ہی نظام میں کام کرتے ہیں اور ایک مضبوط ایل نینو پہلے سے گرم ہوتی ہوئی دنیا میں بعض شدید گرم واقعات کے امکانات کو مزید بڑھا سکتا ہے۔ (باقی آئندہ)

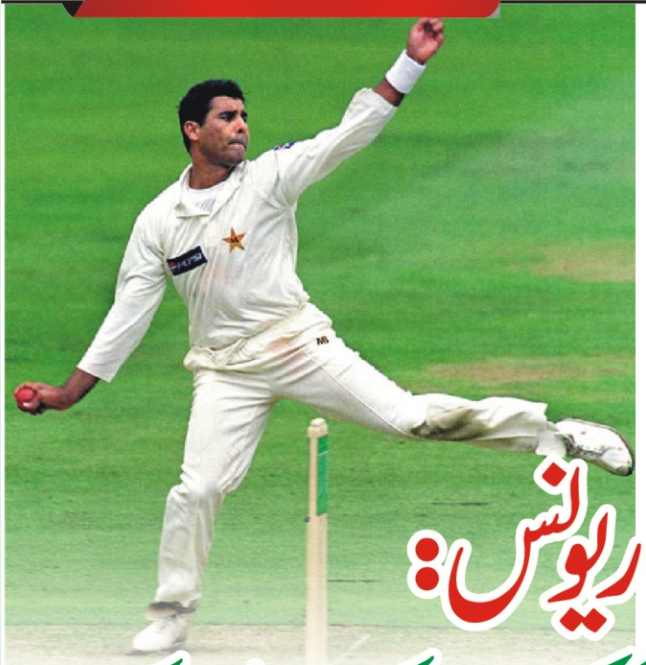

وقار یونس:
بوریوالہ ایکسپریس سے کرکٹ کے میدان تک

قاسم علی

پاکستان کرکٹ کے عظیم فاسٹ بولرز میں شمار ہونے والے وقار یونس نے اپنی برق رفتار گیندوں اور خطرناک یارکرز اور ریورس سوئنگ سے دنیا بھر کے بلے بازوں کو مشکلات سے دوچار کیا، پنجاب کے شہر بوریوالہ سے تعلق رکھنے والے وقار یونس کو ان کی غیر معمولی رفتار کے باعث بوریوالہ ایکسپریس کا لقب دیا گیا۔ وقار یونس نے 1989 میں ٹیسٹ کرکٹ کا آغاز کیا اور کم عمری ہی میں اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے باعث عالمی کرکٹ میں نمایاں مقام بنالیا، ان کا ٹیسٹ ڈیبیو کراچی میں ہوا جبکہ اسی سیریز میں بھارت کے عظیم بلے باز سچن ٹنڈولکر نے بھی بین الاقوامی کرکٹ میں قدم رکھا۔

وسیم اکرم کے ساتھ خطرناک جوڑی

1990 کی دہائی میں وقار یونس اور وسیم اکرم کی جوڑی پاکستان کی سب سے خطرناک فاسٹ بولنگ جوڑیوں میں شمار ہوتی تھی، دونوں کو کرکٹ کی دنیا میں ٹو ڈبلیوز کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ وقار یونس کی خاص پہچان ان کے تیز رفتار یارکرز تھے، وہ نئی اور پرانی دونوں گیندوں سے سوئنگ حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے جبکہ ریورس سوئنگ میں ان کی مہارت نے انہیں اپنے عہد کے نمایاں ترین فاسٹ بولرز میں شامل کردیا۔ وہ یارکر جس نے انگلش بلے بازوں کو لوہے کی ٹوپی والے جوتے یاد دلا دیے وقار یونس کی یارکرز کا خوف اس قدر مشہور تھا کہ 1992 کے دورہ انگلینڈ کے دوران برطانوی صحافت نے بھی اس کا دلچسپ تذکرہ کیا۔

یکم جولائی 1992 کو شائع ہونے والی ایک برطانوی رپورٹ میں وقار یونس کی خطرناک اور آخری لمحے میں اندر آنے والی یارکر کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا کہ انگلینڈ کے بلے بازوں کو اس کا سامنا کرنے کے لیے لوہے کی ٹوپی والے جوتوں کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ وقار کی گیند انتہائی تیزی سے بلے باز تک پہنچتی اور آخری لمحے میں اندر کی طرف مڑتے ہوئے دائیں ہاتھ کے بلے باز کے پاؤں اور وکٹوں کو نشانہ بناتی تھی۔ انگلش بلے باز رابن اسمتھ نے بھی وقار کی اس گیند کو انتہائی خطرناک قرار دیا تھا۔ یہ جملہ بعد میں وقار یونس کی خطرناک یارکرز کی شہرت کا حصہ بن گیا۔ تاہم دستیاب تاریخی رپورٹ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انگلینڈ کے کھلاڑیوں نے حقیقتاً اپنے جوتوں میں لوہے کی ٹو لگوائی تھی۔ لوہے کی ٹوپی والے جوتوں کا حوالہ دراصل وقار کی یارکرز کی شدت بیان کرنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔

یادگار دورہ انگلینڈ 1992

1992 کا دورہ انگلینڈ وقار یونس کے کیریئر کے یادگار ترین ادوار میں شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے سیریز میں 22 وکٹیں حاصل کیں اور اپنی رفتار اور سوئنگ سے انگلش بلے بازوں کو مسلسل دباؤ میں رکھا۔

سیریز کے آخری ٹیسٹ میں بھی وقار یونس نے شاندار بولنگ کا مظاہرہ کیا۔ پاکستان نے میچ 10 وکٹوں سے جیت کر سیریز 1-2 سے اپنے نام کی جبکہ وقار یونس اور وسیم اکرم کو مشترکہ طور پر سیریز کا بہترین کھلاڑی قرار دیا گیا۔

شاندار بین الاقوامی ریکارڈ

وقار یونس نے پاکستان کی جانب سے 87 ٹیسٹ اور 262 ایک روزہ بین الاقوامی میچز کھیلے۔ انہوں نے ٹیسٹ کرکٹ میں 373 جبکہ ایک روزہ کرکٹ میں 416 وکٹیں حاصل کیں۔ ٹیسٹ کرکٹ میں وہ ایک اننگز میں پانچ یا اس سے زیادہ وکٹیں 22 مرتبہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے جبکہ ایک میچ میں 10 یا اس سے زیادہ وکٹیں لینے کا کارنامہ بھی پانچ مرتبہ انجام دیا۔ ان کے کیریئر کی نمایاں خصوصیات میں غیر معمولی رفتار اور سوئنگ اور ریورس سوئنگ اور وکٹ لینے کی صلاحیت شامل تھیں۔

قیادت اور 2003 میں ریٹائرمنٹ

وقار یونس نے پاکستان کرکٹ ٹیم کی قیادت بھی کی۔ 2003 کے عالمی کپ میں وہ پاکستانی ٹیم کے کپتان تھے تاہم ٹیم گروپ مرحلے سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اسی سال وقار یونس نے بین الاقوامی کرکٹ سے ریٹائرمنٹ لے لی۔

کوچنگ کا سفر

ریٹائرمنٹ کے بعد وقار یونس نے کوچنگ کے شعبے میں قدم رکھا۔ وہ پاکستان کے ہیڈ کوچ کے طور پر دو ادوار میں ذمہ داریاں انجام دے چکے ہیں۔ وہ 2010 سے 2011 تک اور پھر 2014 سے 2016 تک قومی ٹیم کے ہیڈ کوچ رہے۔ بعدازاں وہ پاکستان کرکٹ ٹیم کے بولنگ کوچ بھی مقرر ہوئے اور 2019 سے 2021 تک اس عہدے پر کام کیا۔ اس کے علاوہ وہ بھارت کی مقامی کرکٹ لیگ میں حیدرآباد کی ٹیم کے بولنگ کوچ بھی رہ چکے ہیں۔

پاکستان کرکٹ کا یادگار فاسٹ بولر

وقار یونس کا نام پاکستان کرکٹ کی اس نسل کے ساتھ جڑا ہے جس نے دنیا بھر میں تیز رفتار ریورس سوئنگ اور یارکر کو ایک نئی شناخت دی۔ وسیم اکرم کے ساتھ ان کی تاریخی بولنگ شراکت اور غیر معمولی رفتار اور ریورس سوئنگ اور وکٹیں لینے کی صلاحیت نے انہیں پاکستان ہی نہیں بلکہ عالمی کرکٹ کی تاریخ کے یادگار فاسٹ بولرز میں شامل کردیا۔ پاکستان کرکٹ بورڈ نے مارچ 2022 میں وقار یونس کو اپنے ہال آف فیم میں شامل کیا جو پاکستانی کرکٹ میں ان کی طویل خدمات کا اہم اعتراف ہے۔

☆......☆

’میں کوئی خاتونِ آہن نہیں‘: مراکش کی پہلی خاتون وزیرِ اعظم فاطمہ الزہرہ المنصوری کون ہیں؟

......عطاء محمد کاکڑ

مراکش میں اعتدال پسند جماعت پام نے پارلیمانی انتخابات میں اکثریتی نشستیں جیت لی ہیں جس کے بعد فاطمہ الزہرہ المنصوری کو ملک کی پہلی خاتون وزیرِاعظم نامزد کردیا گیا ہے۔اس نامزدگی کے بعد وہ عرب دنیا میں حکومت کی سربراہی کرنے والی صرف دوسری خاتون بن گئی ہیں۔ان سے قبل تیونس کی نجلا بودن اس منصب تک پہنچنے والی پہلی خاتون تھیں۔ ان کا نام شاہ محمد ششم نے وزیرِ اعظم کے طور پر نامزد کیا اور انھیں جماعت کے سرکردہ سیاستدان اور ملک کی فٹ بال فیڈریشن کے سربراہ فوزی لقجع پر ترجیح دی گئی۔50 سالہ فاطمہ الزہرہ کئی برسوں تک مراکش کے شہر مراکش کی میئر رہ چکی ہیں اور اس سے قبل مخلوط حکومت میں بطور وزیر بھی خدمات انجام دے چکی ہیں۔مراکش ایک آئینی بادشاہت ہے، تاہم زیادہ تر اختیارات اب بھی بادشاہ کے ہی پاس ہیں۔

مراکش میں اعتدال پسند جماعت پام نے پارلیمانی انتخابات میں اکثریتی نشستیں جیت لی ہیں جس کے بعد فاطمہ الزہرہ المنصوری کو ملک کی پہلی خاتون وزیرِاعظم نامزد کردیا گیا ہے

وزیرِاعظم کے طور پر اپنے نام کے اعلان سے قبل ایک پریس کانفرنس میں فاطمہ الزہرہ المنصوری سے پوچھا گیا کہ آیا ریاست کو ان کے لیے ان مسلم مذہبی تقریبات میں کوئی تبدیلی کرنا پڑے گی جن میں بادشاہ شرکت کرتے ہیں، جن میں جمعے اور عید کی نمازیں بھی شامل ہیں اور جہاں مرد اور خواتین الگ الگ حصوں میں نماز ادا کرتے ہیں۔انھوں نے اس سوال کا براہِ راست جواب نہیں دیا بلکہ بادشاہ کو ملک میں ’خواتین کے سب سے بڑے حامی‘ کے طور پر سراہا۔انھوں نے کہا ’عالی جاہ دانائی کے حامل ہیں۔۔۔اگر مجھے حکومت کی سربراہی کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے تو یہ میرے لیے ایک بڑا اعزاز ہوگا۔‘

فاطمہ الزہرہ المنصوری مراکش کی سب سے نمایاں خاتون سیاستدان ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے وکیل فاطمہ الزہرہ المنصوری نے دارالحکومت رباط میں واقع محمد پنجم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی، جس کے بعد انھوں نے فرانس اور امریکہ میں اپنی تعلیم جاری رکھی اور کاروباری اور کارپوریٹ قانون میں سپیشلائزیشن کی۔ انھوں نے سنہ 2008 میں پام کے قیام کے بعد سیاست میں قدم رکھا اور سنہ 2009 میں مراکش شہر کی پہلی خاتون میئر بنیں۔ سنہ 2021 کے انتخابات کے بعد وہ دوبارہ اس منصب پر منتخب ہوئیں۔

گذشتہ پانچ برسوں کے دوران وہ سابق وزیرِ اعظم عزیز اخنوش کی حکومت میں قومی علاقائی منصوبہ بندی، شہری منصوبہ بندی، رہائش اور شہری پالیسی کی وزیر کے طور پر خدمات انجام دیتی رہیں۔

فروری 2024 میں وہ پام کی اتحادی لیڈرشپ تنظیم کی کوآرڈینیٹر بنیں۔

فاطمہ الزہرہ نے خود کو ’خاتونِ آہن‘ قرار دیے جانے کے تاثر کو مسترد کرتے ہوئے 2021 میں پام کے جریدے کو بتایا تھا کہ: ’میں نہ فولاد کی بنی ہوئی خاتون ہوں اور نہ آہنی۔۔۔ میں ایک آزاد کارکن ہوں۔‘ اپنے سیاسی کیریئر کے دوران فاطمہ الزہرہ المنصوری نے خواتین کے حقوق یا صنفی عدم مساوات کے موضوعات پر شاذ و نادر ہی عوامی طور پر اظہارِ خیال کیا ہے، حالانکہ مراکش میں ایسے مسائل پر مسلسل بحث جاری رہی ہے، جن میں یہ سوال بھی شامل ہے کہ آیا کثرتِ ازدواج پر پابندی عائد کی جانی چاہیے اور آیا مردوں اور خواتین کو وراثت میں مساوی حقوق ملنے چاہییں۔مراکش کے آئین کے تحت بادشاہ حکومت کے سربراہ کا تقرر اس جماعت میں سے کرتے ہیں جو ایوانِ نمائندگان کے انتخابات میں پہلی پوزیشن حاصل کرے۔

فروری 2024 سے پام کی قیادت ایک واحد سیکریٹری جنرل کے بجائے اجتماعی قیادت کے نظام کے تحت کی جا رہی ہے۔

گذشتہ ہفتے انتخابی نتائج کے اعلان کے بعد المنصوری نے کہا تھا کہ ان اور لقجع میں سے انتخاب کرنا بالآخر بادشاہ کا اختیار ہے۔

ماضی میں وزیرِ اعظم کا تقرر بڑی حد تک ایک رسمی عمل ہوتا تھا کیونکہ مراکش کی زیادہ تر سیاسی جماعتوں کی قیادت ایک ہی سیکریٹری جنرل کے ہاتھ میں ہوتی تھی، جس سے یہ واضح ہوتا تھا کہ حکومت کی سربراہی کے لیے کس شخص کو نامزد کیا جائے گا۔97 نشستیں جیتنے کے بعد بھی پام کے پاس پارلیمان میں اکثریت حاصل نہیں ہے، لہٰذا 395 رکنی پارلیمان میں واضح اکثریت کے لیے درکار 198 نشستوں تک پہنچنے کے لیے اسے اتحادی حکومت تشکیل دینا ہوگی۔ یہ واضح نہیں ہے کہ وہ کس جماعت کے ساتھ اتحاد کریں گی کیونکہ ان کے نیشنل ریلی آف انڈیپینڈنٹس (آر این آئی) کے ساتھ تعلقات خراب ہو چکے ہیں، جو سبکدوش ہونے والی حکومت کی قیادت کر رہی تھی اور جس میں پام ایک چھوٹی اتحادی جماعت کے طور پر شامل تھی۔

اسلام پسند جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی (پی جے ڈی) نے بھی حالیہ انتخابات میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور گذشتہ انتخابات میں حاصل کی گئی صرف 13 نشستوں کے مقابلے میں اس بار 54 نشستیں حاصل کیں۔ اس کامیابی میں جماعت کے رہنما اور سابق وزیرِ اعظم عبدالالہ بنکیران کی واپسی نے اہم کردار ادا کیا۔ ووٹنگ کے بعد بنکیران نے کہا تھا کہ ان کی جماعت حزبِ اختلاف میں ہی رہے گی اور پام کے ساتھ شراکت داری قبول نہیں کرے گی۔

☆......☆

مجھے پہلی بار پاکستان آنے پر خوشی ہوئی:

اسلام آباد میں ایس سی او اجلاس کے اختتام پر انڈین رابطہ کار کا پیغام

پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں شنگھائی تعاون تنظیم (ایس سی او) کے قومی رابطہ کاروں کا تین روزہ اجلاس بدھ کے روز اختتام پذیر ہوگیا ہے۔ اجلاس کے بعد انڈین رابطہ کاری آلوک ڈیمری نے پاکستانی سرکاری میڈیا کو بتایا کہ انھیں پہلی بار پاکستان آنے پر خوشی ہوئی ہے۔ یاد رہے کہ پاکستان نے رواں ماہ ایس سی او کی 2026-27 کے لیے سربراہی سنبھالی ہے اور اگست 2027 میں تنظیم کے سربراہانِ مملکت کے اجلاس کی میزبانی بھی اسلام آباد کو کرنا

ہے۔28 سے 30 ستمبر تک جاری رہنے والے اس اجلاس میں پاکستان کی صدارت کے دوران ایس سی او کی سرگرمیوں کے پروگرام، آئندہ اجلاسوں اور اہم تقریبات کی تیاریوں سمیت تنظیم کے ایجنڈے سے متعلق دیگر امور پر غور کیا گیا۔

پاکستان نے اپنی صدارت کے لیے 'تصور کو عمل میں بدلنا: رابطہ کاری، جدت اور مشترکہ خوشحالی' کا موضوع منتخب کیا ہے، جس کے تحت علاقائی رابطہ کاری، اقتصادی تعاون، جدت اور

رکن ممالک کے عوام کے درمیان روابط کو ترجیح دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس اجلاس میں انڈیا کی شرکت خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کیونکہ یہ دونوں ملکوں کے درمیان دوطرفہ تعلقات میں کشیدگی کے ماحول میں ہورہی ہے۔ اسلام آباد میں ہونے والا یہ اجلاس اگلے سال ہونے والے ایس سی او سربراہی اجلاس کی تیاری کے عمل کا ابتدائی مرحلہ بھی ہے۔

پاکستان نے کہا ہے کہ اگست 2027 میں ہونے والے سربراہی اجلاس میں ایس سی او کے تمام رکن ممالک کے رہنماؤں کو دعوت دی جائے گی، جس میں انڈیا کے وزیر اعظم نریندر مودی بھی شامل ہوں گے۔

'امید ہے دیگر شہر دیکھنے کا بھی موقع ملے گا'

بدھ کے روز پاکستان کی وزارتِ خارجہ نے انڈیا کے قومی رابطہ کار آلوک ڈیمری کی سرکاری میڈیا سے ہونے والی گفتگو اپنے ایکس اکاؤنٹ پر شیئر کی۔ آلوک ڈیمری انڈین وزارت خارجہ میں جوائنٹ سکریٹری ہیں اور وہ ایس سی او کے لیے انڈیا کے کوآرڈینیٹر بھی ہیں۔ انڈین وفد کے سربراہ کا کہنا تھا کہ انھیں پہلی بار پاکستان آنے پر خوشی ہوئی ہے۔ 'میرا پہلا دورہ اسلام آباد کا ہی ہوا ہے۔ دیکھنے کی چاہت لاہور، سیالکوٹ، فیصل آباد ہیں۔ لیکن ہماری سال بھر الگ شہروں میں ملاقاتیں چلتی ہیں۔ لاہور کو ایس سی او کلچرل سٹی بھی قرار دیا گیا ہے۔' انھیں امید ہے کہ انھیں پاکستان کے دیگر شہر دیکھنے اور لوگوں سے ملنے کا موقع ملے گا۔

تنظیم کی صدارت مشرقی ایشیا اور وسطی ایشیا سے ہوتے ہوئے صدارت ہمارے خطے کے پاس آئی ہے جو کہ ایک اہم موقع ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ انڈیا کے وزیرِ اعظم نریندر مودی نے بشکیک میں ایس سی او کے اجلاس میں سویلائزیشن فورم ڈائیلاگ کی ایک کال بھی دی تھی۔ آلوک ڈیمری کا کہنا تھا کہ ایس سی او رہنماؤں نے انڈین وزیرِ اعظم کی کال پر رضامندی بھی ظاہر کی تھی اور اب سویلائزیشن ڈائیلاگ فورم کا اجلاس 20 نومبر کو نیو دہلی میں ہوگا۔ ان کا کہنا تھا کہ 'یہ وہ سفر ہے جس میں یوریشین اور ایشین کے ممالک ایس سی او کے پلیٹ فارم پر ایک ساتھ آئے ہیں اور ہم نے اپنی بہتری، خوشحالی اور بہبود کے لیے ایک ایجنڈا بنایا ہے جس میں کنکٹیوٹی بہت اہم مدعا ہے۔' ان کا کہنا تھا کہ اجلاس کے دوران خطے میں رابطے، ٹرانزٹ اور تجارت جیسے اہم مسائل پر بات چیت ہوئی ہے اور اس میں ترقی بھی ہورہی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ پہلا موقع ہے کہ وہ پاکستان آئے ہیں۔ آلوک دمری نے بتایا کہ ایس سی او کے توسط سے تقریبات سال بھر چلتی رہیں گی اور اسلام آباد سمٹ کے ساتھ ختم ہوں گے۔ 'ہمیں امید ہے کہ ایس سی او کے تحت تعاون کے جتنے بھی اقدامات جاری ہیں، ان میں اضافہ ہوگا۔'

انڈین وفد کے سربراہ نے بتایا کہ ایس سی او میں اب تک بات چیت چینی اور روسی زبانوں میں ہوتی تھی، لیکن پاکستان کی زیرِ صدارت اب جلد ہی انگریزی میں بھی ہوں گی۔ آلوک ڈیمری کی قیادت میں انڈین وفد ایک ایسے وقت میں اسلام آباد آیا جب دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کشیدہ ہیں۔ یہ گذشتہ سال انڈیا اور پاکستان کے درمیان ہونے والی فوجی کشیدگی کے بعد انڈیا کا پاکستان کا پہلا ایسا دورہ بھی ہے۔ اس سے قبل انڈیا کے وزیر خارجہ ایس جے شنکر نے اکتوبر سنہ 2024 میں ایس سی او کی کونسل آف ہیڈز آف گورنمنٹ کے اجلاس میں شرکت کے لیے اسلام آباد کا دورہ کیا تھا۔

انڈیا اور پاکستان نے تقریباً ایک عشرے سے باہمی مذاکرات نہیں کیے ہیں۔ دونوں ملکوں کے درمیان آخری بات چیت دسمبر سنہ 2015 میں ہوئی تھی جب اس وقت کی انڈیا کی وزیر خارجہ سشما سوراج نے 'جامع باہمی مذاکرات' کے عمل کو دوبارہ شروع کرنے کی غرض سے اسلام آباد کا دورہ کیا تھا۔ تاہم جنوری سنہ 2016 میں پٹھان کوٹ پر حملے کے بعد یہ عمل ایک بار پھر رک گیا۔ انڈیا کی حکومت نے یہ موقف اختیار کر رکھا ہے کہ پاکستان سے بات چیت صرف اسی صورت میں ہوسکے گی جب 'فضا دہشت گردی سے پوری طرح صاف ہو۔' تاہم وہ ایس سی او جیسے ملٹی لیٹرل پلیٹ فارم پر پاکستان کے ساتھ شرکت کے لیے تیار ہے۔

'انڈیا کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وہ ایس سی او کے عمل کو خراب نہ کرے'

بین الاقوامی امور کی تجزیہ کار نروپما سبرامنین کہتی ہیں کہ انڈیا اور پاکستان شنگھائی کوآپریشن گروپ میں بہت باقاعدگی کے ساتھ شریک ہوتے رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ 'دونوں ممالک اسے ایک ملٹی لیٹرل پلیٹ فارم سمجھتے ہیں جس میں چین اور روس بھی شامل ہیں۔ اس لیے دونوں کے لیے یہ اہم ہے کہ وہ اس میں شریک ہوں۔' ان کا کہنا تھا کہ 'پاکستان اور انڈیا دونوں ہی چین اور روس سے وسیع تر پارٹنرشپ کے خواہاں ہیں۔ انڈیا ایس سی او اور برکس جیسے فورم کے ذریعے یہ اشارہ بھی دینا چاہتا ہے کہ وہ امریکہ پر منحصر نہیں ہے اور وہ دوسرے پارٹنر بھی چن رہا ہے اور چین جیسے اپنے مخالف ملکوں کے ساتھ بھی پارٹنرشپ کے لیے تیار ہے۔' 'تاہم دباؤ کے باوجود وہ روس کے ساتھ اپنے تجارتی تعلقات برقرار رکھنا چاہے گا۔ ایس سی او میں جو وسطی ایشیا کے ممالک شامل ہیں ان سے انڈیا کے تعلقات سویت یونین کے زمانے سے چلے آرہے ہیں۔ انڈیا ایس سی او کے ذریعے ان تعلقات کو مزید وسعت دینے کی کوشش کر رہا ہے۔'

نروپما مزید کہتی ہیں کہ 'انڈیا کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وہ ایس سی او کے عمل کو خراب نہ کرے۔ جب اسلام آباد کا سربراہی اجلاس آئے گا اس وقت یہ معلوم ہوگا کہ انڈیا کا اس اجلاس کے تئیں کتنا سنجیدہ ہے۔' ان کا کہنا ہے کہ 'پہلے کے سربراہی اجلاس میں وزیر اعظم مودی جاتے رہے ہیں، اسلام آباد کے اجلاس میں وہ جاتے ہیں کہ نہیں یہ دیکھنا ہوگا۔ کیونکہ سارک دس برس سے رکا ہوا ہے۔ سارک کا سربراہی اجلاس نومبر 2016 میں اسلام آباد میں ہونا تھا لیکن اوڑی میں حملے کے بعد وزیر اعظم وہاں نہیں گئے۔' 'اگر مودی ایس سی او کے سربراہی اجلاس میں شرکت کرتے ہیں تو کیا وہ سارک میں بھی جاسکتے ہیں؟ یہ سوال بھی اٹھے گا۔'

(بقیہ: پی ٹی آئی کا اسلام آباد لانگ مارچ اور خیبر پختونخوا میں ایمرجنسی یا گورنر راج کی بازگشت)

طویل المدت میں یہ صورتحال مذاکرات اور سیاسی حل کی طرف لے جاسکتی ہے یا پھر مزید تصادم کی۔ وفاقی حکومت اس وقت پی ٹی آئی کو موقع دے رہی ہے کہ وہ مارچ منسوخ کرے اور محاذ آرائی ختم کرے تو کچھ معاملات حل کیے جا سکتے ہیں۔ پی ٹی آئی اس کو کمزوری سمجھ سکتی ہے یا موقع۔ چار اکتوبر قریب آ رہا ہے اور اگلے چند دن فیصلہ کن ثابت ہوں گے۔ آئین کے پاس اختیارات ہیں مگر ان کا استعمال سیاسی حکمت عملی، سیکیورٹی تشخیص اور قومی مفاد کے توازن پر منحصر ہے۔ خیبر پختونخوا کی عوام جو دہشت گردی اور سیاسی عدم استحکام دونوں کا شکار ہیں، ان کے لیے یہ بحران مزید مشکلات کا باعث بن سکتا ہے۔ پاکستان کو اس لمحے پر احتیاط سے سوچنا ہوگا کہ آئینی طاقت کا استعمال جمہوری اصولوں اور وفاقی ہم آہنگی کو مضبوط کرے یا مزید تقسیم کا باعث بنے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ عارضی حل اکثر مستقل مسائل پیدا کرتے ہیں اور موجودہ قیادتوں کو اس سبق کو یاد رکھنا چاہیے۔

اس پورے معاملے کا گہرائی سے جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ لانگ مارچ محض ایک احتجاجی اقدام نہیں بلکہ وفاقی اور صوبائی سطح پر طاقت کے توازن کی جنگ کا اظہار ہے۔ پی ٹی آئی اپنے کارکنوں کو متحرک کر کے اس بات کا ثبوت دینا چاہتی ہے کہ وہ اب بھی عوامی حمایت کی حامل ہے جبکہ وفاقی حکومت سیکیورٹی اور آئینی دلائل کے ذریعے اس تحریک کو محدود کرنا چاہتی ہے۔ دونوں طرف سے بیانات سخت ہیں مگر عملی اقدامات میں ابھی تک احتیاط برتی جارہی ہے۔ گورنر راج یا ایمرجنسی کا نفاذ آسان نہیں کیونکہ اس کے لیے صدر، پارلیمان اور اتحادی جماعتوں کی حمایت درکار ہے اور بعد میں عدالتی جائزہ بھی ممکن ہے۔ ماضی کے تجربات بتاتے ہیں کہ ایسے اقدامات سے سیاسی مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ اکثر مزید پیچیدہ ہوجاتے ہیں۔ خیبر پختونخوا جیسے حساس صوبے میں جہاں قبائلی علاقے، سرحدی چیلنجز اور دہشت گردی کے مسائل موجود ہیں، کوئی بھی وفاقی مداخلت احتیاط کا تقاضا کرتی ہے۔ پی ٹی آئی کے اندرونی اختلافات بھی اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ پارٹی مکمل طور پر متحد نہیں اور کچھ رہنما مارچ کے ممکنہ نتائج سے پریشان ہیں۔ شوکت یوسفزئی کا خط اس سوچ کی عکاسی کرتا ہے کہ پارٹی کو وسیع تر قومی مفاد میں سوچنا چاہیے نہ کہ صرف سیاسی پوائنٹ اسکورنگ میں۔

آئین کی تفصیلات پر مزید غور کریں تو آرٹیکل 232 میں اندرونی انتشار کی تعریف وسیع ہے مگر اسے ثابت کرنا مشکل ہوسکتا ہے۔ صدر کو مطمئن ہونا پڑتا ہے کہ صوبائی حکومت قابو نہیں پاسکتی۔ گورنر راج کے لیے گورنر کی رپورٹ اہم ہوتی ہے اور موجودہ گورنر فیصل کریم کنڈی کے بیانات اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ وہ صورتحال کو سنگین سمجھتے ہیں۔ تاہم عملی طور پر وفاقی حکومت اس وقت فوری اقدام سے گریز کر رہی ہے اور پی ٹی آئی کے اگلے اقدامات کا انتظار کر رہی ہے۔ اگر مارچ پرامن رہا اور محدود رہا تو شاید صورتحال قابو میں رہے۔ اگر تصادم ہوا تو حالات تیزی سے بدل سکتے ہیں۔ اس پورے عمل میں میڈیا، سول سوسائٹی اور عوام کا کردار بھی اہم ہوگا کیونکہ وہ ہی بالآخر اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ کون سا راستہ درست ہے۔ پاکستان کی سیاست ہمیشہ سے ایسی ہی رہی ہے جہاں آئینی اختیارات سیاسی اوزار بن جاتے ہیں اور موجودہ بحران بھی اسی روایت کا تسلسل ہے۔ اگلے چند ہفتے اس بات کا تعین کریں گے کہ آیا یہ بحران مذاکرات کی طرف جاتا ہے یا مزید تلخی پیدا کرتا ہے۔ دونوں طرف سے دانشمندی اور قومی مفاد کو ترجیح دینے کی ضرورت ہے ورنہ نتائج ناقابل تلافی ہوسکتے ہیں۔

☆......☆

(بقیہ: امریکی اور برطانوی فوجیوں کا مکمل انخلا)

ان کا کہنا ہے کہ اس سے خطہ غیر مستحکم ہوا اور ایران کو اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کا موقع ملا۔

سلیمن بھی مانتے ہیں کہ تبدیلی کا عمل مشکل رہا، تاہم ان کا کہنا ہے کہ برسوں کے دوران بہت سے عراقیوں نے انھیں بتایا کہ وہ صدام حسین کے خاتمے کے بعد آنے والی سیاسی تبدیلی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے مطابق عراق میں نمائندہ جمہوریت کے تصور نے جڑ پکڑ لی ہے، اگرچہ ایسی آبادی میں جمہوری روایات کو مضبوط ہونے میں وقت لگے گا جسے اس کا پہلے بہت کم تجربہ تھا۔

واشنگٹن کی امریکن یونیورسٹی میں گلوبل کردش انیشی ایٹو فار پیس کے ڈائریکٹر بریوان سعید بھی اس حوالے سے مثبت رائے رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: 'سابق حکومت کا خاتمہ واقعی بڑی بات تھی۔' ان کے مطابق ناقدین اُس جبر کو نظرانداز کر دیتے ہیں جس کا خاتمہ ہوا۔ اگرچہ بدعنوانی اب بھی موجود ہے، لیکن ان کے خیال میں 2003 سے پہلے کے مقابلے میں عراق میں سیاسی آزادی زیادہ ہے، خصوصاً عراقی کردستان میں۔ ہیلیئر اس پورے سوال کو جمہوریت کے تناظر میں دیکھنے کو ہی مسترد کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: 'لوگوں کو یہ سوال پوچھنا چھوڑ دینا چاہیے کہ کیا امریکہ نے عراق میں جمہوریت قائم کی؟ نہیں، اور یہ معاملہ طے ہوچکا ہے۔' ان کے نزدیک زیادہ اہم میراث علاقائی ہے: 'صدام کو ہٹانے کے نتیجے میں بالآخر ایرانی نیٹ ورکس ریاست کے اندر سرایت کر گئے اور اُس توازن کی جگہ لینے لگے جسے واشنگٹن نے ختم کیا تھا۔'

تاہم چاروں ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ عراق اب بھی اُس مستحکم جمہوریت سے بہت دور ہے جس کا تصور امریکی پالیسی سازوں نے 2003 میں کیا تھا۔ ان کے مطابق بدعنوانی وسیع پیمانے پر موجود ہے اور مسلح گروہ اب بھی ریاستی اداروں کے ساتھ ساتھ طاقت رکھتے ہیں، خصوصاً پاپولر موبلائزیشن فورسز (پی ایم ایف) میں شامل سخت گیر دھڑے، جنھیں بغداد مکمل طور پر ریاستی کنٹرول میں لانے کی کوشش کررہا ہے۔

آگے کیا ہوگا؟

صفوان الامین انخلا کو عراق میں امریکی اثر و رسوخ کے خاتمے کے طور پر نہیں دیکھتے۔

وہ کہتے ہیں: 'امریکہ کے پاس اب بھی کافی اثر و رسوخ ہے کیونکہ عراق اپنی تیل کی فروخت کے لیے امریکی ڈالر پر انحصار کرتا ہے۔ عراق ہتھیاروں کی خریداری کے لیے بھی امریکہ پر انحصار کرتا ہے اور اپنے علاقائی پڑوسیوں سے متعلق مسائل سے نمٹنے کے لیے امریکی سفارتی حمایت کا محتاج ہے۔' سعید کے مطابق اس اثر و رسوخ کا ایک حصہ ملک میں واشنگٹن کی سفارتی موجودگی سے جڑا ہے۔ وہ کہتے ہیں: 'بغداد میں دنیا کا سب سے بڑا امریکی سفارت خانہ موجود ہے۔ اربیل میں دنیا کا سب سے بڑا امریکی قونصل خانہ موجود ہے۔' وہ نشاندہی کرتے ہیں کہ فوجی انخلا کے بعد بھی ان دونوں تنصیبات کو مسلسل تحفظ درکار رہوگا۔ سلیمن کے مطابق امریکہ اور عراق کے درمیان 'بہت گہرا فوجی تعلق' برقرار رہے گا، جس میں عراقی فوج، انسدادِ دہشت گردی سروس اور نیم خودمختار کردستان کے مسلح دستوں پیشمرگہ کو تربیت اور منصوبہ بندی میں مدد شامل رہے گی۔ تاہم سب سے بڑا غیر یقینی عنصر ایران کی حمایت یافتہ عراقی عسکری گروہ ہیں۔ عراقی وزیر اعظم علی الزیدی ابتدا میں چاہتے تھے کہ 30 ستمبر تک ان گروہوں کو مکمل طور پر ریاستی اختیار کے تحت لے آیا جائے، لیکن اطلاعات کے مطابق یہ تنظیمیں 2027 کے اختتام تک توسیع چاہتی ہیں۔

ماہرین اس بارے میں اختلاف رکھتے ہیں کہ آیا یہ ٹائم لائن بھی حقیقت پسندانہ ہے یا نہیں۔

سعید کہتے ہیں: 'ایسا نہیں ہونے والا۔'

وہ عراق کے سیاسی اور مالیاتی نظام میں ملیشیاؤں کی گہری جڑیں، پارلیمان میں ان کی موجودگی اور تہران کے ساتھ ان کے تعلقات کا حوالہ دیتے ہیں۔ تاہم سلیمن ایک ممکنہ مثبت پہلو بھی دیکھتے ہیں۔ ان کے مطابق امریکی فوجیوں کی عدم موجودگی میں ملیشیائیں ایک اہم سیاسی ہتھیار کھو سکتی ہیں، جس سے بغداد کو ان پر دباؤ ڈالنے کے لیے زیادہ گنجائش مل سکتی ہے۔ تاہم وہ ایک زیادہ سنگین خطرے سے خبردار کرتے ہیں: 'میں نے متعدد عراقی وزرائے اعظم سے بات کی ہے جو اس خدشے کا اظہار کرتے ہیں کہ اس سے خانہ جنگی یا ممکنہ طور پر عراق کے اندر ایک اور داخلی جنگ جنم لے سکتی ہے۔'

سعید کو داعش کے دوبارہ ابھرنے کا بھی خدشہ ہے اور وہ اسے 2011 کے انخلا کے بعد کے حالات سے جوڑتے ہیں۔ ان کے مطابق جب امریکی فوجی نکل گئے تھے تو بغداد کی شیعہ قیادت والی حکومت نے سنی رہنماؤں کی گرفتاری اور انھیں سیاسی عمل سے باہر کرنے کی مہم شروع کی، جس نے بہت سے سنی فرقہ سے تعلق رکھنے والوں کو انتہا پسندی کی طرف دھکیلا اور داعش کے عروج میں مدد دی۔

سعید خبردار کرتے ہیں کہ چونکہ سنی برادریاں ایک بار پھر اپنے مستقبل کے حوالے سے فکر مند ہیں، اس لیے انتہا پسندی کا خطرہ نمایاں ہے۔

سلیمن اس سے زیادہ پُرامید ہیں اور کہتے ہیں کہ عراقی سکیورٹی فورسز ایک دہائی پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط ہیں اور کسی بھی ایسے خطرے سے نمٹنے کی بہتر صلاحیت رکھتی ہیں۔

علاقائی سطح پر ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ انخلا عراق میں امریکہ اور ایران کے درمیان طاقت کے توازن کے بارے میں نئے سوالات بھی پیدا کرتا ہے۔ صفوان الامین کے مطابق ایران 'اگر ممکن ہوا تو اپنا اثر و رسوخ مزید مضبوط کرے گا' اور وہ خبردار کرتے ہیں کہ اس انخلا کو لازماً حتمی نہ سمجھا جائے۔ وہ کہتے ہیں: 'امریکی فوج 2011 میں بھی عراق چھوڑ چکے تھے، لیکن چند سال بعد دوبارہ واپس آگئے تھے۔ یہ کہانی کے ایک باب کا خاتمہ ہے، پوری کہانی کا نہیں۔'

☆......☆

مقصود خالد
بیورو چیف لاہور

جرابوں میں پیاز: نزلہ زکام کا قدیم نسخہ یا سوشل میڈیا کا دھوکہ

کیا جرابوں میں پیاز رکھنے سے نزلہ زکام ٹھیک ہو سکتا ہے؟

پیاز کے کچھ مرکبات لیبارٹری میں بعض بیکٹیریا کے خلاف کام کر سکتے ہیں لیکن وائرس پر ان کا اثر ثابت نہیں ہوا، اور وہ بھی صرف اس وقت جب پیاز کھایا جائے۔

سوشل میڈیا کی دنیا میں جب کوئی ویڈیو وائرل ہوتی ہے تو اس کے پیچھے اکثر سائنس سے زیادہ جذبات، خوف اور آسان حل کی تلاش چھپی ہوتی ہے۔ چند ماہ قبل ایک خاتون نے ہاتھ میں کچا پیاز پکڑے ہوئے اپنی بیٹی کی نزلہ زکام کی علامات بیان کرتے ہوئے کہا کہ اگر آپ کو نزلہ زکام ہے تو صرف اتنا کرنا ہے کہ پیاز کاٹ کر جراب میں رکھیں اور رات بھر پہن کر سو جائیں۔ یہ ویڈیو ہزاروں شیئرز کے ساتھ پھیل گئی اور جلد ہی والدین، دادا دادی اور صحت کے شوقین افراد کے گروپس میں یہ نسخہ بار بار دہرایا جانے لگا۔ کچھ لوگ اسے تیز بخار کا علاج قرار دیتے ہیں، کچھ کہتے ہیں کہ یہ جراثیم اور بیکٹیریا کو ختم کرتا ہے، زہریلے مادے جذب کرتا ہے اور خون صاف کرتا ہے۔ یہ دعوے نئے نہیں ہیں۔ وہی پرانی کہانی نئی شکل میں سامنے آتی ہے جو صدیوں سے لوک طب میں چلتی آ رہی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعی جرابوں میں رکھے گئے کچے پیاز کے ذریعے جسم سے کوئی زہریلا مادہ باہر نکلتا ہے یا نزلہ زکام کا وائرس ختم ہو جاتا ہے؟ اس تحقیقاتی فیچر میں ہم اس دعوے کی جڑوں تک پہنچتے ہیں، تاریخی پس منظر کا جائزہ لیتے ہیں، جدید طبی سائنس کی روشنی میں اس کا تجزیہ کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ پیاز کی حقیقی صحت بخش خصوصیات کہاں تک کام کرتی ہیں۔

یہ رپورٹ صرف ایک ویڈیو کا جواب نہیں بلکہ اس بڑی رجحان کا محاسبہ ہے جس میں آن لائن طبی مشورے سائنسی زبان استعمال کرتے ہوئے لوگوں کو ثبوت کے بغیر نسخے اپنانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ نزلہ زکام ایک عام وائرل بیماری ہے جو اکثر خود ہی ٹھیک ہو جاتی ہے، لیکن جب والدین بیمار بچوں کو ایسے غیر ثابت شدہ طریقوں پر چھوڑ دیتے ہیں تو تاخیر سے طبی مدد لینے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اس نسخے کو محض رد یا قبول نہ کریں بلکہ اس کے پیچھے چھپی کہانی، سائنس اور معاشرتی اثرات کو مکمل طور پر سمجھیں۔

پیاز یعنی ایلیئم سیپا کا تعلق ایلیئم خاندان سے ہے جو دنیا بھر کی غذاؤں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کی طبی تاریخ بہت پرانی ہے۔ امریکہ کی نیشنل اونیئن ایسوسی ایشن کے مطابق کمرے میں کچا پیاز رکھنے کا خیال پندرہویں صدی تک جاتا ہے جب لوگ مائیز ما یعنی زہریلی ہوا کے نظریے پر یقین رکھتے تھے۔ طاعون جیسے امراض کو ''خراب ہوا'' سے منسوب کیا جاتا تھا اور مضبوط خوشبو والے مادے جیسے پیاز، لہسن اور جڑی بوٹیاں اس ہوا کو جذب کرنے کے قابل سمجھے جاتے تھے۔ قرون وسطیٰ میں لوگوں نے لمف نوڈز پر پیاز رگڑنے کا طریقہ بھی اپنایا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس سے زہریلے مادے باہر نکل آئیں گے۔ کچھ مقامات پر پیاز کو طاعون کے دانوں پر لگانا بھی مروج تھا۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں انفلوئنزا کی وباؤں کے دوران بھی یہ باور عام رہا کہ کمرے میں کاٹا ہوا پیاز رکھنے سے وائرس ختم ہو جاتا ہے۔ چین کی روایتی طب میں پاؤں کی ریفلیکسولوجی کا تصور بھی اس نسخے سے جوڑا جاتا ہے جہاں پاؤں کے مخصوص نقاط کو جسم کے مختلف اعضاء سے مربوط سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ تمام نظریات جدید جراثیم کے علم سے پہلے کے دور کے ہیں۔ جب جرمنی، فرانس اور برطانیہ کے سائنسدانوں نے مائکروبس کی دریافت کی تو مائیز ما کا نظریہ ختم ہو گیا۔ پھر بھی لوک طب میں یہ کہانی زندہ رہی اور اب سوشل میڈیا نے اسے نئی زندگی دے دی ہے۔ تاریخی حوالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پیاز کو کبھی کبھی بیرونی زخموں یا سوجن پر استعمال کیا گیا، اور اس کے سلفر مرکبات میں کچھ اینٹی بیکٹیریل خصوصیات لیبارٹری میں نظر آئی ہیں، لیکن جسم کے اندرونی انفیکشن کو پاؤں کے تلوے سے کھینچنے کا کوئی معتبر ثبوت کبھی سامنے نہیں آیا۔ Culpeper جیسے پرانے ہربلسٹوں نے بھی پیاز کو ''فساد کھینچنے والا'' قرار دیا تھا، لیکن ان کے مشاہدات تجرباتی سائنس پر مبنی نہیں تھے۔ آج جب ہم اس تاریخ کو دیکھتے ہیں تو سمجھ آتا ہے کہ کیوں لوگ اب بھی اس پر یقین رکھتے ہیں — یہ ایک تسلسل ہے جو خوف اور امید کے امتزاج سے پیدا ہوا۔

جدید طبی سائنس اس دعوے کو مکمل طور پر مسترد کرتی ہے۔ جلد جسم کا پہلا دفاعی نظام ہے جو جراثیم کو اندر داخل ہونے سے روکتی ہے، لیکن وہ زہریلے مادوں کو باہر نکالنے کا راستہ نہیں بنتی۔ پسینے کے ذریعے بھی بہت محدود مقدار میں فضلہ خارج ہوتا ہے اور وہ بھی مخصوص مادے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر کیٹی سولیٹا جیسے متعدی امراض کے ماہرین واضح طور پر کہتے ہیں کہ پیاز کو جلد کی رکاوٹ کے ذریعے زہریلے مادے باہر کھینچنے کے لیے طبیعیات کے قوانین توڑنے پڑیں گے۔ پیاز میں کوئی ایسی جادوئی خصوصیت نہیں جو پاؤں کے تلووں سے وائرس یا ٹاکسن نکال سکے۔ جو لوگ رات بھر جراب میں رکھے پیاز کے رنگ بدلنے کو ثبوت سمجھتے ہیں وہ دراصل ہوا میں موجود آکسیجن اور جلد پر موجود بیکٹیریا کے ساتھ پیاز کے کیمیائی ردعمل کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ نزلہ زکام وائرس کی وجہ سے ہوتا ہے نہ کہ بیکٹیریا کی۔ پیاز کے کچھ مرکبات لیبارٹری میں بعض بیکٹیریا کے خلاف کام کر سکتے ہیں لیکن وائرس پر ان کا اثر ثابت نہیں ہوا، اور وہ بھی صرف اس وقت جب پیاز کھایا جائے۔ ''ٹاکسن'' کی اصطلاح سوشل میڈیا پر اکثر مبہم طور پر استعمال ہوتی ہے جبکہ طبی لحاظ سے زہریلے مادے وہ ہوتے ہیں جو بیکٹیریا پیدا کرتے ہیں یا زیادہ مقدار میں لی گئی دوائیں اور کیمیکلز۔ جسم کا اپنا ڈیٹاکس سسٹم جگر اور گردے پر مشتمل ہے جو خون صاف کرتے ہیں اور فضلہ خارج کرتے ہیں۔ انہیں کسی خاص نسخے کی ضرورت نہیں۔ برطانوی نیشنل ہیلتھ سروس واضح طور پر کہتی ہے کہ اگر کوئی نقصان دہ مادہ نگل لیا جائے تو گھر میں ڈیٹاکس کرنے کے بجائے فوری طبی مشورہ لیں۔ اس پورے معاملے میں سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ لوگ سائنسی زبان استعمال کرنے والے آن لائن دعووں پر بھروسہ کر کے بروقت طبی مدد میں تاخیر کر دیتے ہیں۔ ماہرین کا مشورہ ہے کہ جب کوئی شخص کہے کہ پیاز یا کوئی سپلیمنٹ ٹاکسن خارج کرتا ہے تو پوچھیں کہ کون سے ٹاکسن اور کیسے؟ اگر جواب واضح نہ ہو تو اسے شک کی نظر سے دیکھیں۔

پیاز کے کچھ مرکبات لیبارٹری میں بعض بیکٹیریا کے خلاف کام کر سکتے ہیں لیکن وائرس پر ان کا اثر ثابت نہیں ہوا، اور وہ بھی صرف اس وقت جب پیاز کھایا جائے۔ ''ٹاکسن'' کی اصطلاح سوشل میڈیا پر اکثر مبہم طور پر استعمال ہوتی ہے جبکہ طبی لحاظ سے زہریلے مادے وہ ہوتے ہیں جو بیکٹیریا پیدا کرتے ہیں یا زیادہ مقدار میں لی گئی دوائیں اور کیمیکلز۔ جسم کا اپنا ڈیٹاکس سسٹم جگر اور گردے پر مشتمل ہے جو خون صاف کرتے ہیں اور فضلہ خارج کرتے ہیں

پیاز کی حقیقی صحت بخش خصوصیات اس وقت سامنے آتی ہیں جب اسے کھایا جائے۔ اس میں وٹامن سی، فائبر، اینٹی آکسیڈنٹس اور خاص طور پر کوئرسیٹن نامی فلاوونائیڈ پایا جاتا ہے جس پر سوزش کم کرنے، اینٹی آکسیڈنٹ اور مدافعتی نظام کو متوازن کرنے والی خصوصیات کی تحقیق ہوئی ہے۔ کئی جائزوں میں دیکھا گیا ہے کہ کوئرسیٹن اور پیاز کے دوسرے مرکبات سوزش کے راستوں کو متاثر کر سکتے ہیں، بعض سائٹوکائنز کو کم کر سکتے ہیں اور کچھ جانوروں کے ماڈلز میں سانس کی نالی کی سوزش میں مددگار ثابت ہوئے ہیں۔ ایک میٹا اینالیسس میں فلاوونائیڈز کی سپلیمنٹیشن سے اوپری سانس کی نالی کے انفیکشنز کی شرح میں کمی دیکھی گئی، لیکن یہ نتائج کھانے یا سپلیمنٹ کے ذریعے حاصل ہوئے نہ کہ پاؤں پر لگانے سے۔ پیاز کا سوپ نزلہ زکام کے دوران ہائیڈریشن اور غذائیت فراہم کر سکتا ہے اور گلے کی خراش میں آرام دے سکتا ہے، لیکن یہ علاج نہیں۔ نزلہ زکام عموماً ایک ہفتے کے اندر خود ہی بہتر ہو جاتا ہے۔ این ایچ ایس کے مطابق آرام، کافی مقدار میں سیال اور صحت بخش غذا سب سے اہم ہیں۔ اگر بخار کئی دن تک رہے یا بچوں میں علامات شدید ہوں تو ڈاکٹر سے رجوع ضروری ہے۔ سوزش خود جسم کا دفاعی ردعمل ہے جسے ہمیشہ ختم کرنا ضروری نہیں۔ اس کی جگہ اور وجہ کے مطابق علاج طے ہونا چاہیے۔ پیاز کھانے سے مدافعتی نظام کو بالواسطہ سپورٹ مل سکتی ہے لیکن جراب میں رکھنے سے کوئی ایسا راستہ نہیں بنتا جو جسم کے اندرونی وائرس تک پہنچے۔

آخر میں یہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ سوشل میڈیا پر پھیلنے والے طبی نسخے اکثر حقیقی سائنس کو مسخ کر دیتے ہیں۔ پیاز ایک مفید سبزی ہے لیکن اسے جادوئی علاج بنا دینا نہ صرف بے بنیاد ہے بلکہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے کیونکہ یہ لوگوں کو ثبوت پر مبنی علاج سے دور کر سکتا ہے۔ جسم کے قدرتی نظاموں — جگر، گردے، مدافعتی خلیات — کو متوازن غذا، آرام اور پانی سے مدد مل سکتی ہے۔ جب اگلی بار کوئی ویڈیو میں پیاز کی جراب کا نسخہ دکھائے تو یاد رکھیں کہ سائنس نے بار بار اس کا جائزہ لیا ہے اور کوئی معتبر ثبوت نہیں ملا۔ بہتر ہے کہ پیاز کو کھانے میں شامل کریں، آرام کریں اور اگر ضرورت ہو تو طبی مشورہ لیں۔ یہی حقیقی صحت مندرویہ ہے۔